علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت

اشاعت کا سولہواں سال

جلد (۱۶)
شمارہ (۱۰)
اکتوبر ۱۹۸۰ء

پونم

خط و کتابت کا پتہ
منیجر ماہنامہ پونم 16-7-300 A
اعظم پورہ - حیدرآباد ۲۴

زر سالانہ ۲۰ روپے
لائبریریوں سے ۲۵ "
بیرونی ممالک سے ۳۰ شلنگ
فی شمارہ 1/50

ایڈیٹر :- ناصر کرنولی ایم اے

ترتیب

مطبوعہ :- دائرہ الیکٹرک پریس، اچھتہ بازار۔ حیدرآباد

آندھراپردیش میں سریکاکولم ضلع کا جنگی اساس پر اھتمام

سیلاب زدگان کیلئے بےافراط امدادی اقدامات

آندھراپردیش کے چیف منسٹر نے راجہ کمیونسٹ کے مانند یہ نہیں کہا کہ ہیروں کو واپس جانے کا حکم دینگے یہ کام لارڈ وینکٹیشورا کے سپرد کر دیا جن کے چرنوں میں چیف منسٹر پرارتھنا میں مصروف تھے لارڈ وینکٹیشورا کے فضل و کرم کے سہارے اور اس طرح کے ہنگامی حالات سے نمٹنے میں اپنے تجربے کی بدولت انہوں نے صورتحال پر قابو پالیا اور سیلاب کے باعث ہونیوالے نقصان کی تلافی کیلئے وسیع اور موثر اقدامات شروع کر دیئے۔

نقصان کی وسعت :-

- ۱۵۸ مواضعات میں ۵ر۱ لاکھ اشخاص متاثر ہوئے ہیں
- ایک لاکھ ایکڑ سے زائد رقبہ میں دھان، گنا اور مونگ پھلی کی فصلیں یا تو زیر آب ہیں یا بہہ گئی ہیں
- اندیشہ ہے کہ بڑی تعداد میں مویشی اور مرغیاں ہلاک ہو گئی ہیں۔
- چھوٹی آبپاشی کے بیسیوں تالابوں اور سڑکوں میں شگاف پڑ گئے ہیں۔
- مٹی سے بنی ہوئی ہزاروں جھونپڑیاں منہدم ہو گئی ہیں۔

امدادی اقدامات :-

- ضلع سریکاکولم کے ۱۵۸ سیلاب زدہ مواضعات میں فی الفور امدادی کاموں کیلئے ایک کروڑ روپیوں کی منظوری۔
- ہر خاندان کو ۱۰ کیلو چاول اور ہر شخص کو ایک جوڑا کپڑوں کی فوری فراہمی
- متاثرہ عوام میں عمارتی سامان کی تقسیم
- وبائی امراض کے انسداد کیلئے فوری طبی امداد

یہ بھی ان اقدامات سے چند اقدام جو حالیہ سیلاب کے باعث پیدا شدہ مسائل سے نمٹنے کیلئے کئے گئے۔ یہ سیلاب ماضی میں آئے ہوئے سیلابوں کے مقابلے میں ڈیڑھ گنا شدت کا حامل تھا۔ دفاعی عہدیداروں کی جانب سے ۱۰ کشتیاں اور ۳ ہیلی کاپٹر امدادی کاموں میں مصروف کر دیئے گئے۔ ہیلی کاپٹروں نے پانی میں گھرے ہوئے عوام کے لیے ایک دن میں ۴۰۰۰ ہزار غذائی پیکٹ گرائے۔ ضلع کلکٹر کو ہدایت کی گئی ہے کہ جس قدر عملے کی ضرورت ہو پڑوسی اضلاع سے بلا لیا جائے۔

"مصیبت زدوں کی امداد کی فراہمی میں پیسہ رکاوٹ نہیں بنے گا"

چیف منسٹر

جاری کردہ - محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، حکومت آندھراپردیش

IIPR B1724/ADVT/I-C3/80
Dt: 22.9.80

وہاب عندلیب

کنڑا ادب کے جدید رجحانات

کنڑا زبان قریباً دو ہزار برسوں سے ادبی و تہذیبی میراث کی حامل رہی ہے لیکن کنڑا ادب کا آغاز کب ہوا؟ وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تاحال نویں صدی کے راشٹرکوٹ راجا اموگ درش کی تصنیف "کویی راج مارگ" ہی کنڑا ادب کی پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ دسویں صدی عیسوی میں مشہور جینی شعرا "پمپا"، "پون" اور "رن" نے کنڑا زبان و ادب کے گیسو سنوارے۔ کارو یاسن نے کنڑی میں مہا بھارت لکھی۔ پرندر داس اور کنک داس نے بھی کنڑا ادب کو مالا مال کیا۔ بارہویں صدی کے وسط میں مہاتما بسویشور اور ان کے ساتھیوں الّم پربھو، اکّا مہا دیوی اور چن بسوا نے کنڑا ادب کی خدمت کی خصوصاً شہری بسویشور کے وچن کنڑا ادب میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس طرح ہر دور میں کنڑا ادب نے مسلسل ترقی کی ہے۔

دیگر زبانوں کے ادب کی طرح کنڑا ادب بھی ایک عرصہ تک حسن و عشق کے گیت گاتا رہا مگر بیسویں صدی کے آغاز میں کنڑا ادب نے نئی کروٹ لی۔ اس زبان کے ادیب و شاعر بھی غلامی اور خارجی تسلط کے خلاف صف آرا ہوگئے۔ انھوں نے مغربی طرزِ معاشرت کے خلاف آواز اٹھائی، چھوت چھات کے خلاف جہاد کیا۔ مختلف فرقوں میں ہم آہنگی پیدا کی اور عوام کو انگریز سامراج کے مقابلے کے لیے آمادہ کیا۔ حصولِ آزادی تک کنڑا ادب ان ہی موضوعات سے عبارت تھا اور یہی رجحان NAVODAYA TRADITION یعنی رومانیت پسندی کہلایا۔ اس رجحان کے حامی نہ فطرت پسند ہیں اور نہ ہی ماضی پرست۔ وہ کیٹس اور شیلی کے مقلد بھی ہیں۔ انھیں فرد کے ذاتی غم کے بجائے سماجی مسائل سے دلچسپی ہے۔

ڈی۔ آر۔ بیندرے رومانیت پسند رجحان کے عظیم شاعر ہیں بیندرے شاعر ہونے کے علاوہ نقاد، ڈرامہ نویس، انشائیہ نگار اور بلند پایہ مفکر بھی ہیں۔ انسان دوستی، آفاقیت، صوفیانہ بصیرت اور جہد للبقا ان کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں بیندرے کو ان کے شعری مجموعے "ناکو تنتی" کی اشاعت پر گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ممتاز شاعر کے۔ وی۔ پٹپا بھی اسی رجحان کے علمبردار ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ کنڑا کے پہلے اہلِ قلم ہیں جنھیں ۱۹۶۷ء میں ان کے شعری مجموعے "راماین درشن" پر گیان پیٹھ ایوارڈ عطا کیا گیا۔ وہ ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ ان کا ناول "ملے گلل لی مدومگلو" MALE GALALLI MADU MAGULU کنڑا کے افسانوی ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس رجحان کے ناول نگاروں میں شیورام کارنتھ امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ کارنتھ نہ صرف نامور ناول نویس، اہم ڈرامہ نگار و ممتاز ماہر تعلیم ہیں بلکہ قدیم آرٹ "یاکشا گانا بیلاٹا" کے احیا کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔ انھیں سائنس، موسیقی، رقص، مصوری اور فنِ تعمیر سے بھی دلچسپی ہے۔ کارنتھ نے قریباً ۵۰ ناول لکھے۔ ان کا اہم ناول "چومن ڈوڈی" کنڑا ادب میں سماجی حقیقت نگاری کی مثال ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ایک ہریجن کسان ہے جو اپنے افرادِ خاندان کے ساتھ زمین داروں اور سماج کے ٹھیکہ داروں کے ظلم سہتا ہے۔ کارنتھ کو ان کے ناول "موکا جیا کنا سوگلو" یعنی (گونگی کے خواب) کی اشاعت پر ۱۹۷۷ء میں گیان پیٹھ ایوارڈ دیا گیا۔ ان کے دیگر اہم ناول "مرلی منے گے" "آودار بیدا ارونتی" "بیٹیدا جیوا" "آلی دا میلے" وغیرہ ہیں۔ کارنتھ ادب کو سیاسی

ناہیر کا آلہ بنانے کے سخت مخالف ہیں۔ انھیں سیاسی عقائد کی بجائے شخصی تجربات کی بنیاد پر صداقت کی تلاش سے دلچسپی ہے۔ اسی مکتبِ فکر کے ایک اہم ناول نگار راؤ بہادر ہیں جن کا ناول "گرام یانا" "GRAMAYANA" دیہی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔

سرکار نگا بھی اسی رجحان کے نمائندہ ممتاز ڈرامہ نگار ہیں اُن کی تخلیقات میں فلسفے کے علاوہ علامتوں کا استعمال عام ہے۔ فلسفہ آمیز ڈراموں میں "سبجی دیتی" اور "سادوتری" قابلِ ذکر ہیں دوسرے اہم ڈرامے "اندھیرا اُجالا" اور "رنگا بھارت" ہیں۔

۱۹۴۰ء کی ابتداء میں اے۔ این کرشنا راؤ نے رومانیت پسندی کے خلاف بغاوت کرکے پرگتی شیل ساہتیہ کی داغ بیل ڈالی انہوں نے رومانیت پسندوں کی بورژوائیت کی مذمت کی اور ترقی پسند نظریات کا پرچار کیا اس نئے رجحان کے مطابق ادب میں مقصدیت کو ضروری قرار دیا گیا اور ادیبوں سے خواہش کی گئی کہ وہ خاموش تماشائی نہ رہیں بلکہ سماجی انقلاب کے لئے عملی جد وجہد میں حصہ لیں اس گروہ نے فطرت پرستی کی وکالت کی۔ کرشنا راؤ نے آزادی کے بعد .. ایسے زاید ناول لکھے۔ ان کے بیشتر ناول ترقی پسند نظریات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ٹی۔ آر سبا راؤ، نرنجن، البوراج کٹی منی وغیرہ کا شمار ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے اس تحریک کے زیر اثر جو ادب تخلیق ہوا وہ وقت کا آئینہ دار اور عوامی زندگی سے قریب ہے۔

آزادی کے بعد سنہ ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ کنڑا ادب میں بھی NAVYA یعنی جدیدیت کا آغاز ہوا۔ اس رجحان کے محرک ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور ازرا پاؤنڈ کے افکار و نگارشات سے متاثر تھے دراصل جدیدیت رومانیت پسندی اور ترقی پسندی کا ردِّ عمل ہے۔ اس رجحان کے مطابق آج کا انسان کل سے زیادہ گوناگوں مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ اس کا دماغ ذہنی پراگندگی اور تفکرات کی آماجگاہ بنتا جا رہا ہے اس لیے ادبی تخلیقات میں بھی زندگی کی پیچیدگیوں اور تلخیوں کو جگہ دی جانی چاہئے۔ کنڑا ادب میں اس جدید رجحان کے امام گوپال کرشنا اڈیگا ہیں۔ آزادی کے بعد اُبھرنے والے کنڑا شاعروں میں اڈیگا کو خاص مقام حاصل ہے۔ ان کے تین شعری مجموعے چندا مدّڈلے CHANDA MADDALE، بھومی گیت اور وردھا منا جدیدیت کا انمول خزینہ ہیں۔ اڈیگا کی بعض نظمیں مشاہدۂ باطنی کی عمدہ مثال ہیں اور بعض نظمیں فرد اور سماج کے تعلق کو ظاہر کرتی ہیں۔ اڈیگا نے اپنے احساسات کو نیا اسلوب اور موثر زبان دی ہے۔ نئی نسل کے بیشتر اہلِ قلم اڈیگا سے بے حد متاثر ہیں۔ ماہنامہ "ساکشی" کنڑا ادب میں جدیدیت کا علمبردار ہے جس کے ایڈیٹر کے۔ وی۔ سبیا ہیں۔

یو۔ آر۔ اننت مورتی بھی جدید افسانہ نگار ہیں۔ اُن کا ناول "سمسکارا" ادبی حلقوں میں کافی موضوعِ بحث رہا ہے۔ اننت مورتی روایات کے مخالف اور عصری و عمرانی قدروں کے محافظ ہیں۔ پی لنکیش ابتداء میں اڈیگا سے متاثر تھے مگر بعد میں انھوں نے ادب میں اپنا علیحدہ مقام بنالیا۔ لنکیش نے کنڑا ادب کو اظہار کے نئے اسلوب سے روشناس کرایا۔ لنکیش کے مختصر افسانوں اور ڈراموں میں تشدد کو بالادستی حاصل ہو گئی ہے جب کہ اڈیگا کی شاعری میں روحانی عنصر اور اننت مورتی کی تحریروں میں جنس و دیگر جبلتیں کارفرما نظر آتی ہیں چندرشیکھر کمبار جدید شاعر اور ڈرامہ نویس ہیں۔ قوتِ متخیلہ اور لوک محاوروں کے استعمال کے لحاظ سے کمبار کی نگارشات رومانیت پسند۔ ڈی۔ آر بیندرے کی ہمسری کرتی نظر آتی ہیں۔ جدید افسانہ نگار و ڈرامہ نگار پورنا چندر تیجا سوی کنڑا ادب میں انفرادیت کے حامل ہیں ان کا ناولٹ سوروپ (SWAROOPA) اور ڈرامہ "یملا پرشن" مکمل انفرادیت رکھتے ہیں۔ شاعر و افسانہ نگار اے۔ کے راما نوجن اور ناول نگار گیری بھی جدیدیت سے متاثر ہیں۔ نئی نسل کے ڈرامہ نگاروں میں گریش کرناڈ کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ ان کا ڈرامہ "تغلق" ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔ الیشونت چتال جدید افسانہ نگاروں میں اہم مرتبے کے حامل ہیں۔ اُن کے مختصر افسانے

جدید کنڑ ادب کا سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔
شانتی ناتھ ڈیسائی کے مختصر افسانے بھی
جدید حلقوں میں دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں
ان کا ناول "مکتی" جدید ادب میں سنگِ میل
کی حیثیت رکھتا ہے۔ جدید لہجے کے شاعر
چندر شیکھر پاٹل بھی اپنے مخصوص طنزیہ مزاج
سے پہچانے جاتے ہیں ان کے علاوہ رام چندر
شرما، پی نرسمہا چاری، اکبر علی، سندی، نثار
احمد اور چندر کانت کسنور وغیرہ نے بھی
اڈیگا کی تقلید کرتے ہوئے جدیدیت کو
فیشن اور نعرہ ہونے کے طور پر استعمال
کرلیا ہے یعنی وہ کنڑ ادب میں اپنی مستقل
جگہ نہیں بنا سکیں گے۔

پروفیسر گوکاک کی جدت پسندی بھی
کنڑ ادب کا ایک اہم رجحان ہے۔ گوکاک نے
۱۹۵۰ء میں کنڑ ادب کو جدید اسلوب اور
رویئے سے آشنا کیا۔ ان کی جدت پسندی
زبان اور ہئیت کی حد تک محدود رہی جہاں
تک متن اور طرزِ ادا کا تعلق ہے وہ رومانیت
پسندوں سے بنیادی اختلاف نہیں رکھتے۔
ان کے شعری مجموعے "نئی نظمیں" اور "سمندر کے
گیت" جدت پسندی کے مظہر ہیں۔ گوکاک
سے متاثر ہونے والوں میں گنگا دھر چتال، ایس
آر۔ ایکنڈی، ایس آر۔ بوکاشی وغیرہ ہیں
مشہور کنڑ شاعر سدیا پرانک کا بھی اسی
مکتب سے تعلق ہے جن کے شعری مجموعے "آبشار
مانس سرور"، "رحم کا ساون"، "لہروں کی مالا"
کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ بعد میں گوکاک نے
"سماں دُوائی" کے نام سے ایک نئی تحریک شروع
کی جس کا مقصد کنڑ ادب کے مختلف رجحانات
کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنا اور ادب کو
خانوں میں منقسم ہونے سے روکنا ہے۔ اس
رجحان سے وابستہ اہلِ قلم زندگی کے کسی
جُز کی بجائے کُل زندگی پر نظر رکھتے ہیں
اور انفرادیت کا احترام کرتے ہیں کسی
بھی تحریک سے اختلاف کرنے کی بجائے
اس کی خوبیوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ گوکاک
اور ان کے ساتھیوں نے اپنے ان رجحانات
کے پرچار کے لیے ایک ماہنامہ "سماں
وائی" جاری کیا تھا جو اب بند ہو گیا ہے
پروفیسر گوکاک کے علاوہ اس نقطۂ نظر کی
حمایت کرنے والے ممتاز نقاد جیسے اشور
درپا، چن ویر کناوی، سدیا پرانک،
نرسمہا مورتی، بیج تیرتھ وغیرہ ہیں۔
سدیا پرانک کا نیا شعری مجموعہ "پہلے
انسان بنو" ان ہی رجحانات کی نمائندگی
کرتا ہے۔

حال میں "بھنڈریہ ساہتیہ" کے نام
سے ایک گروہ ادبی اُفق پر نمودار ہوا ہے
یہ تحریک سماج کے کمزور، پسماندہ اور پست
کردہ طبقات کے باغی نوجوانوں نے
شروع کی ہے جو ہر قسم کے استحصال کے
خلاف ہیں۔

ان مختلف رجحانات کے باعث کنڑ کا جوہرِ
ادب بوقلمونی تنوع اور رنگارنگی سے مملو ہے اور
وہ ہر صنفِ سخن میں مسلسل ترقی کر رہا ہے۔

ترقی اردو بورڈ کی تازہ مطبوعات

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
تعلیم سماج اور کلچر	اے۔ کے۔ سی۔ اوٹاوے / اختر انصاری	10 - 00
مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال	آر۔ پی۔ ترپاٹھی / ریاض احمد خان شیروانی	23 - 50
جنوبی ہند کی تاریخ	کے۔ ایل۔ نیل کنٹھ شاستری / آر۔ کے۔ بھٹناگر	22 - 00
وادی سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	سر مورٹیمر وہیلر / زبیر رضوی	8 - 00
خلجی خاندان	کے۔ ایس۔ لال / محمد یسین مظہر صدیقی	16 - 50
تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں	ایس۔ یم جعفر / سعید انصاری	8 - 25
قدیم ہندی فلسفہ	ماٹرے شیو موہن لال ماتھر	15 - 50
نالاڈیار (کلاسیکی تامل شلوکوں کا مجموعہ)	غازی حمید اللہ خان	4 - 75
دفتری انتظامیہ	بشمبھر سہائے / محمد سعید	12 - 00
مدرسہ عمل	اڈولف فیرئیر / شیخ غلام حسین	9 - 75
سائنس کی تدریس	ڈی۔ ایس۔ مترا اور آر۔ سی۔ شرما۔ غلام دستگیر	16 - 00
شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال	اے۔ ایل۔ باڈنگٹن / نجم الحسن	15 - 75
ہندوستانی گاؤں	شیاما چرن ڈوبے / محمد عبدالقادر عمادی	10 - 75
ہندوستانی صنعتوں میں انصرام عملہ	نجم الحسن	8 - 75
پرندوں کی زندگی اور ان کی معاشی اہمیت	محشر عابدی	11 - 00
ہندوستان کے سماجی مسائل (انٹرمیڈیٹ سال دوم)	محمد عبدالقادر عمادی	5 - 50
تاریخ فلسفہ اسلام (دوسرا ایڈیشن)	ٹی۔ جے۔ بوئر / سید عابد حسین	5 - 50
لسانی مطالعے (" ")	گیان چند جین	8 - 50
ہمارا قدیم سماج (" ")	سید سخی حسن نقوی	6 - 50
دلنتے	زیڈ۔ اے۔ عثمانی	8 - 25
فیودر دستوئیفسکی	ظ۔ انصاری	8 - 50

بچوں کے لیے

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
نورتن کہانیاں	مرتبہ شمیم احمد	6 - 50
بھارت کی لوک کتھائیں (حصہ اول)	محمد قاسم صدیقی	3 - 00
بھارت کی لوک کتھائیں (حصہ دوم)	" " "	3 - 00
بھارت کی لوک کتھائیں (حصہ سوم)	" " "	3 - 00
فٹبال کی کہانی	راج نرائن راز	6 - 00
مولو نارودم کی کہانیاں	مرتبہ محمد حفیظ الدین	2 - 00
نصوح کا خواب	" حفیظ عباسی	3 - 50

کتابوں اور دیگر معلومات کے لیے پتے پر لکھیں۔

SALES & EXHIBITION UNIT
BUREAU FOR PROMOTION OF URDU
MINISTRY OF EDUCATION & CULTURE
WEST BLOCK 8, R.K. PURAM,
NEW DELHI - 110022

شعبۂ فروخت و نمائش
بیورو فار پروموشن آف اردو
وزارت تعلیم و ثقافت
ویسٹ بلاک ۸، آر۔ کے۔ پورم
نئی دہلی ۲۲۔۱۱۰۰

DWP 80/220

ولیم بلیک
شوکت یوسف زئی

مکھی

مری ننھی سی مکھی!
کھیل کو تیرے
مٹا کر رکھ دیا ہے ہاتھ نے میرے
تہی دامن ہے جو فکر و نظر سے
بتا تو ہی کہ کیا ہے فرق تجھ میں اور مجھ میں
نہیں ہوں کیا تری مانند میں بھی ایک مکھی؟
نہیں ہے کیا مری مانند تو بھی ایک انسان
کہ تیری ہی طرح میں بھی گاتا بجاتا، ناچتا، گاتا ہوں اور
کھاتا ہوں، پیتا ہوں۔

یہاں تک کہ
مٹا دیتا ہے اندھا ہاتھ کوئی
میری ہستی کو
اگر ہے فکر ہی نام جیون کا
توانائی کا طاقت کا تو اجل ہے نام گویا اُس کی چاہت کا
تو پھر میں بھی ہوں ایک مکھی
خوش و خرم
رہوں زندہ کہ مر جاؤں!!!

بیمار گلاب

تو بیمار ہے اے گلاب چمن
تری سرخ خوشیوں کے بستر کو
اک کرم نادیدہ نے پا لیا ہے
وہی کرم نادیدہ
جو کالی راتوں
بھیانک فضاؤں میں
اُڑتا ہے یوں جیسے چھلاوا ہو کوئی
مجھے ڈر ہے اس کی سیہ اور خفیہ محبت
نہ برباد کر دے کہیں
تیری ہنستی ہوئی زندگی کو

(انگریزی سے ترجمہ)

تمکین الرحمٰن

یادوں کے نقوش

مرے کمرے کی الماری میں
مدت سے پڑے ہیں زرد سے کاغذ
پرانے کاغذوں کے ڈھیر کو میں نے حفاظت سے
اٹھا رکھا ہے، کہ ان میں
نہاں ہیں میرے بچپن اور جوانی کے کئی قصّے / وہ بھولی داستانیں
جن کو گردِ وقت نے میرے ذہن کی قبر میں دفنا دیا ہوتا
سہارے سے مگر ان کاغذوں کے
ابھر آتی ہیں یادیں، خواب بن کر

یہی سپنے مری ویران راتوں کا سہارا ہیں
تمہارا مرمریں پیکر
جھلکنے لگتا ہے ماضی کی دھندلی رہگذاروں پر
کسی صفحے سے خوشبو کی مہک کچھ اب بھی آتی ہے
ترے مخصوص لہجے میں لکھی تحریر باقی ہے
کہیں اوراق میں پوشیدہ کوئی پھول مرجھایا
کہیں تتلی کا پر، جس نے پرانا قصہ دوہرایا

پرانے کاغذوں کے ڈھیر میں
بیتے دنوں کی داستانیں ہیں
چھپا ہے ان میں تیرے وصل کا ہر اک حسیں لمحہ

میں اکثر سوچتا ہوں / پرانے کاغذوں کو چاک کر دوں؟ اور جلا ڈالوں،
نہ جانے کیوں / نہیں ہے حوصلہ مجھ میں
کہ ان بوسیدہ اوراقِ پریشاں کو جلا پاؤں مگر نہ جانے کیوں۔

...الرحمٰن عقیل

اس کی آواز وہی
رنگ کا لہجہ بھی وہی
اور خوشبو بھی وہی
جب بھی ملتی ہے تو کلیاں سی چٹک جاتی ہیں
قربت کی ساعتِ گُل رنگ مہک جاتی ہیں
ذوقِ نظارہ کا مہکا ہوا آنگن جیسے
دور بجتے ہوں پری چہروں کے جھانجھن جیسے
یاد کی چاندنی مہتاب لٹائے برسوں
زندگی صبح کے نغمات سنائے برسوں
فکر و دانش کے در و بام سجائے برسوں

نظمیں

عقیل شاداب

ایک نظم

میری پیشانی پہ جو تحریر ہے
اور جو میری ہتھیلی پر رقم ہے
وہ جو ان دیکھے خدا نے لکھ دیا ہے
ایک اَن دیکھے قلم سے
میری لوحِ زندگی پر
میری اک اک سانس کا سارا حساب
اُس نوشتہ کا سراپا روپ ہوں میں
کیا میں خود اپنے کئے کا آپ ذمہ دار ہوں
یاد ہی ہے
جس نے مجھ کو لکھ دیا ہے
اور روانہ کر دیا ہے، مجھ کو یہ بہروپ دے کر
ایک انجانے سفر پر

رؤف صادق

سرپھری ہوائیں

گرد پر لکھے ہوئے
تمہارے مختلف ۔۔۔ نام
ہواؤں میں بکھر گئے
گرد، گرد ہو گئے

چاند، تارے اور سورج
جن کی مٹھیوں میں بند تھے

خیمے وہ اکھڑ گئے
کھو گئے غبار میں
ہوائیں اتنی تیز تھیں
آگ پانی اور زمیں جس کی زد میں آ گئے
بکھر گئے ......
بکھر گئے ......

سرپھری ہوائیں سب
چاروں سمت سر پٹکتی پھیلتی چلی گئیں
تمہارے مختلف ۔۔۔ نام
ہواؤں میں بکھر گئے
بکھر گئے
گرد، گرد ہو گئے

ساحل احمد

طر کا طلسم ٹوٹ گیا
زبر کا طلسم ٹوٹ گیا

فرشتے ہوا سے اُلجھیں گے
ب و نظر کا طلسم ٹوٹ گیا

پلیں گے آنسوؤں کے دیئے
ر کا طلسم ٹوٹ گیا

رسے گھروندگی رونقیں دیکھیں
کا طلسم ٹوٹ گیا

گا یہ شعلہ ہوا کی قسمت میں
گھر کا طلسم ٹوٹ گیا

آنسو نکل پڑے ساحل
ہ نثر کا طلسم ٹوٹ گیا

زیب غوری

کچھ نہ تھا جو ٹوٹ کر بکھرا، عجب اسرار ہے
میں سمجھتا تھا کہ سر پر سایۂ دیوار ہے

دُور دُور اب وہ سرابِ کم نگاہی بھی نہیں
دم کہاں لیجے کہ سورج نقشِ بے دیوار ہے

میری سرد آنکھوں میں ہے دم توڑتے سورج کا عکس
دُور تک نیلے سمندر پر لہو کی دھار ہے

پھر غبارِ شام سایہ چاک پیڑوں پر گرا
پھر ہوائیں ٹوٹتے لمحات کی جھنکار ہے

روشنی کے دائرے کو توڑتی جاتی ہے ریت
پھیلتے صحرا میں شمعِ جستجو بیکار ہے

ہے ہواؤں میں ابھی تک رات کی بارش کا نم
نیلگوں کہرے کا سناٹا سرِ اشجار ہے

دُھند ہے اور سرمئی کہسار کی چوٹی پہ زیب
زرد شہپرِ صوت اُڑنے کے یہ تیار ہے

انیس الرحمٰن

ایک گُل شاخ پہ تنہا دیکھوں
اپنا ہی عکس تڑپتا دیکھوں

کسی فٹ پاتھ پہ رک جاؤں اگر
ہانپتے شہر کا چہرہ دیکھوں

آئینے ٹوٹ گئے قدروں کے
کیسے اب اپنا سراپا دیکھوں

روشنی یاد کی لَو دینے لگی!
اپنا بسرہ ہوا چہرہ دیکھوں

خواب کا شہر سجاؤں ہر شب
اور مر جانے کا سپنا دیکھوں

آئینہ جھانک رہا ہے مجھ میں
آج میں اپنا تماشا دیکھوں

حسرم محمد آبادی

تب پینے پلانے کی نکلی تو تھی نا مکمل مگر گفتگو رہ گئی
بزمِ ساقی پہ بھی حرف آیا نہیں بادہ خواروں کی بھی آبرو رہ گئی

ہو لی بسر کہانی بھی بادہ گی سلسلہ قصۂ غم کا جاری رہا
ہجراں سے بھی بچھڑ کے باتیں ہوئیں پھر بھی کچھ حسرتِ گفتگو رہ گئی

بیا اس کا ہے ساقی دلربا حرف دربادی پر بھی آجائیگا
میخواروں کے دل میں باقی اگر کچھ تمنائے جام و سبو رہ گئی

یہ ربط سی زندگی میں کہاں آپ اک حادثہ ہی سمجھتے ہیں
ماں کی بہاریں تو بھولیں مگر یاد کچھ شوخیٔ رنگ و بو رہ گئی

پیرِ پُر تکلف کے تھے اٹھ گئے یک بیک طلب سامنے آ گئے
انتظار جو مسکرانے لگی اُدم بجز کوششِ جستجو رہ گئی

ناں چاکِ دامن کی سنتے رہے ختم ہونے سے پہلے نہ معلوم کیوں
لگر اپنی محفل سے وہ اٹھ گئے بیچ میں داستانِ رفو رہ گئی

اُمید ان سے یہ ہرگز نہ تھی وہ سراہیں گے سن کے مرے شعر کو
بالِ غزل نے غزل کیا نئی میرے افکار کی آبرو رہ گئی

ساجد رضوی

کوئی غم بھی جسے محسوس نہیں ہوتا ہے
دل وہی دردِ محبت کا امیں ہوتا ہے

خود جسے اپنی محبت کا یقیں ہوتا ہے
وہ کسی شرط کا پابند نہیں ہوتا ہے

جب نظر ٹھوکریں کھاتی ہے تڑپ جاتا ہے دل
چوٹ لگتی ہے کہیں درد کہیں ہوتا ہے

یہی ہوتا ہے محبت میں کرشمہ اکثر
جو نکلتا ہے زباں سے وہ نہیں ہوتا ہے

مضطرب ہو کے جہاں لیتے ہو تم نام مرا
زندگی کا مجھے احساس وہیں ہوتا ہے

شامِ غم آئی تو دل نے مرے محسوس کیا
تجھ سے بڑھ کر تو ترا ذکر حسیں ہوتا ہے

عالمِ نشہ میں جاتا رہے ساقی کا لحاظ
اہلِ میخانہ میں ایسا بھی کہیں ہوتا ہے

اس سے تو ربطِ دلی اور بھی کھل جائیگا
کیوں مرے ذکر پہ وہ چیں بہ جبیں ہوتا ہے

آستاں کی نہیں پابند جبینِ ساجد
آستاں آپ ہی پابندِ جبیں ہوتا ہے

رفیق جعفر
(نذرِ استادِ جلیل)

دل کے سکون کے واسطے ہم جب وہاں چلے
دل نے ہمیں سے پوچھا کہ حضرت کہاں چلے

ہنسنا تو اور بات ہے رونا بھی تھا محال
پھر کس خوشی میں آج یہ اشکِ رواں چلے

اپنی انا کی کھوج میں ہم جب نکل پڑے
سائے کی طرح ساتھ کئی آسماں چلے

اب ہم یہ چاہتے ہیں عبادت کے نام پر
سجدوں کے ساتھ ساتھ ترا آستاں چلے

میری یہ آرزو ہے کہ اب میرے سامنے
قینچی کی طرح لالہ رخوں کی زباں چلے

منزل کی جستجو میں ہی بھٹکا ہے کارواں
بھٹکے ہوئے کے ساتھ میں ہم بھی کہاں چلے

اس راستے کو ہم نے تو ٹھکرا دیا رفیق
جس راستے کے موڑ پہ فن کی دکاں چلے

غزلیں

زیب غوری

کچھ نہ تھا جو ٹوٹ کر بکھرا عجب اسرار ہے
میں سمجھتا تھا کہ سر پر سایۂ دیوار ہے

دور تک دور اب وہ سرابِ کم نگاہی بھی نہیں
دم کہاں لیجئے کہ سورج نقشِ بے دیوار ہے

میری سرد آنکھوں میں ہے دم توڑتے سورج کا عکس
دور تک نیلے سمندر پر لہو کی دھار ہے

پھر غبارِ شام سایہ چاک پیڑوں پر گرا
پھر ہوا میں ٹوٹتے لمحات کی جھنکار ہے

روشنی کے دائرے کو توڑتی جاتی ہے ریت
پھیلتے صحرا میں شمعِ جستجو بیکار ہے

ہے ہواؤں میں ابھی تک رات کی بارش کا نم
نیلگوں کہرے کا سناٹا سرِ اشجار ہے

دھند ہے اور سرمئی کہسار کی چوٹی پہ زیب
زرد شہپر دھوپ اڑنے کے لیے تیار ہے

ساحل احمد

دیارِ فکر و نظر کا طلسم ٹوٹ گیا
تمام زیر و زبر کا طلسم ٹوٹ گیا

خود آگہی کے فرشتے ہوا سے اُلجھیں گے
اگر یہ قلب و نظر کا طلسم ٹوٹ گیا

ابھی تو اور بھی چمکیں گے آنسوؤں کے دیئے
نجومِ شمس و قمر کا طلسم ٹوٹ گیا

جو اس نے پھر سے گھروندے کی رونقیں دیکھیں
تمام گنبد و در کا طلسم ٹوٹ گیا

دمک اُٹھے گا یہ شعلہ ہوا کی قید میں
اگر یہ لعل و گہر کا طلسم ٹوٹ گیا

نگارِ وقت کے آنسو نکل پڑے ساحل
گلوں کے دیدۂ تر کا طلسم ٹوٹ گیا

انیس الرحمٰن

ایک گل شاخ پہ تنہا دیکھوں
اپنا ہی عکس تڑپتا دیکھوں

کسی فٹ پاتھ پہ رک جاؤں اگر
ہانپتے شہر کا چہرہ دیکھوں

آئینے ٹوٹ گئے قدروں کے
کیسے اب اپنا سراپا دیکھوں

روشنی یاد کی لَو دینے لگی!
اپنا بکھرا ہوا چہرہ دیکھوں

خواب کا شہر سجاؤں ہر شب
اور مر جانے کا سپنا دیکھوں

آئینہ جھانک رہا ہے مجھ میں
آج میں اپنا تماشا دیکھوں

جرم محمد آبادی

بات پینے پلانے کی نکلی تو تھی نامکمل مگر گفتگو رہ گئی
فیضِ ساقی پہ بھی حرف آیا نہیں بادہ خواروں کی بھی آبرو رہ گئی

بھولی بسری کہانی بھی یاد آگئی سلسلہ تذکرۂ غم کا جاری رہا
رات ہجراں سے بھی جی بھر کے باتیں ہوئیں پھر بھی کچھ حسرتِ گفتگو رہ گئی

دیکھیے اس کا ہے ساقیٔ دلربا ظرف دریا دلی پر بھی آجائیگا
پیر میخواروں کے دیکھیں باقی اگر کچھ تمنائے جام و سبو رہ گئی

ربط بے ربط سی زندگی بن گئی اب اک حادثہ ہی سمجھنے لگے
گلستاں کی بہاریں تو بھولیں مگر یاد کچھ شوخیٔ رنگ و بو رہ گئی

بیٹھے پیرِ تکلف کے تھے اُٹھ گئے یک بیک سب طلب سامنے آگئے
چشمِ طناز جو مسکرانے لگی ادھر کچھ کوششِ جستجو رہ گئی

داستاں چاکِ دامن کی سنتے رہے ختم ہونے سے پہلے نہ معلوم کیوں
لیکے انگڑائی محفل سے وہ اُٹھ گئے بیچ میں داستانِ رفو رہ گئی

مجھکو امید ان سے یہ ہرگز نہ تھی وہ سراہیں گے سن کے مرے شعر کو
جرم جانِ غزل نے غزل کیا سنی میرے افکار کی آبرو رہ گئی

ساجد رضوی

کوئی غم بھی جسے محسوس نہیں ہوتا ہے
دل وہی دردِ محبت کا امیں ہوتا ہے

خود جسے اپنی محبت کا یقیں ہوتا ہے
وہ کسی شرط کا پابند نہیں ہوتا ہے

جب نظر ٹھوکریں کھاتی ہے تڑپ جاتا ہے دل
چوٹ لگتی ہے کہیں درد کہیں ہوتا ہے

یہی ہوتا ہے محبت میں کرشمہ اکثر
جو نکلتا ہے زباں سے وہ نہیں ہوتا ہے

مضطرب ہو کے جہاں لیتے ہو تم نام مرا
زندگی کا مجھے احساس وہیں ہوتا ہے

شامِ غم آئی تو دل نے مرے محسوس کیا
تجھ سے بڑھ کر تو ترا ذکر حسیں ہوتا ہے

عالمِ نشہ میں جاتا ہے ساقی کا لحاظ
اہلِ میخانہ میں ایسا بھی کہیں ہوتا ہے

اس سے تو ربطِ دلی اور بھی کھل جائیگا
کیوں مرے ذکر پہ وہ چیں بہ جبیں ہوتا ہے

آستاں کی نہیں پابند جبینِ ساجد
آستاں آپ ہی پابندِ جبیں ہوتا ہے

رفیق جعفر

(نذرِ استادِ جلیل)

دل کے سکون کے واسطے ہم جب وہاں چلے
دل نے ہمیں سے پوچھا کہ حضرت کہاں چلے

ہنسنا تو اور بات ہے رونا بھی تھا محال
پھر کس خوشی میں آج یہ اشکِ رواں چلے

اپنی انا کی کھوج میں ہم جب نکل پڑے
سائے کی طرح ساتھ کئی آسماں چلے

اب ہم یہ چاہتے ہیں عبادت کے نام پر
سجدوں کے ساتھ ساتھ ترا آستاں چلے

میری یہ آرزو ہے کہ اب میرے سامنے
قینچی کی طرح لالہ رخوں کی زباں چلے

منزل کی جستجو میں ہی بھٹکا ہے کارواں
بھٹکے ہوئے کے ساتھ میں ہم بھی کہاں چلے

اس راستے کو ہم نے تو ٹھکرا دیا رفیق
جس راستے کے موڑ پہ فن کی دکاں چلے

وہ میرے ساتھ کھیلیں گے ممی۔ گیند۔ رنگ اور ڈاٹ گیم؟

ضرور کھیلیں گے!

ممی۔ وہ۔ وہ!" ننھا ہچکچا کر بولا

کیا وہ بھی۔ باپ کا نام پوچھیں گے؟

سیما کا دماغ سنسنا گیا۔

اسکول کل چلیں گے۔ تم جاؤ۔ باہر جا کے گیند کھیلو!۔" اُس نے جھنجھلا کے کہا اور ننھا کمرے سے نکل آیا۔ ایک عجیب مسئلہ اس کے سامنے آ گیا تھا۔ ننھے کا اسکول میں شریک کرانا ضروری تھا اگر وہ کوئی فرضی نام باپ کے سلسلے میں لے دیتی۔ تو کیا۔ ایسا ممکن نہیں تھا وہ کہہ سکتی تھی۔ ننھے کا باپ امریکہ لندن یا عرب کے کسی ملک میں قسمت آزمائی کے لیے چلا گیا ہے لیکن یہ بڑا جھوٹ کب تک نبھتا؟ کب تک؟

"خدا تجھے غارت کرے۔ او بے وفا سنگدل ظالم آدمی۔ تو نے مجھے اس عذاب میں ڈالا ہے۔ وہ کون سا منحوس وقت تھا جب تو نے مجھے سبز باغ دکھائے تھے۔ ہائے مجھی کو ہوش آ گیا ہوتا۔ میں اس طرح تباہ نہ ہوتی۔ آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب اُس بیدرد نے باپ بننے کی خوشخبری سنتے ہی آنکھیں پھیر لیں ساتھ نہ دیا۔ پھر اس سے ملا بھی نہیں۔ کہیں دکھائی نہ دیا۔ بہت دنوں بعد اس نے خبر سنی تھی کہ وہ اپنی کمپنی کی طرف سے امریکہ بھجوا دیا گیا ہے۔ اس نے اس کی کمپنی سے پتہ حاصل کیا اور اسے درجنوں خط لکھ ڈالے۔ التجا آمیز، گڑگڑاتے ہوئے خط، دھمکی سے لبریز، بد دعاؤں کوسنوں اور گالیوں سے بھرے ہوئے لیکن سب بیکار اس کے ایک خط کا جواب بھی نہ ملا۔ اور وہ بس روتی رہ گئی۔

اس کا مستقبل برباد ہو گیا۔ گھر کی رہی نہ باہر کی۔ باپ لاپرواہ تھا ماں سوتیلی بہن بھائی غیر۔ اس کی ایک راز دار سہیلی نے اس کی مدد کی تھی۔ ناجائز بچے کی پیدائش کے بعد اس نے سیما کو مشورہ دیا کہ وہ اس شہر سے کہیں چلی جائے۔!

وہ تھوڑی سی نقدی اور اپنی بی۔اے کی سند لے کر دہلی سے حیدرآباد آ گئی۔ اس مصروف ترین شہر میں کسی کو، کسی کا حال جاننے کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے ایک خانگی فرم میں ملازمت حاصل کر لی۔ اور کسی نہ کسی طرح تین سال کھینچ ہی ڈالے۔

بڑی پھیکی بدمزہ زندگی تھی۔ اسے پل بھر کے لیے بھی ماضی بھلائے نہ بھولتا۔ وہ سجیلے سپنے خواب اس پر ہنستے تھے۔ جن کی تعبیر ننھے کی شکل میں اس کے سامنے تھی۔!

وہ اب بھی اسلم کو بے وفا دھوکے باز سمجھنے پر تیار نہ ہوتی! مگر کب تک۔ آنسو اس کا ماضی بہا لے گئے۔ اور وہ ننھے کی صورت میں بہل گئی اس کی پرورش میں سیما نے ان گنت دکھ برداشت کیے لیکن اسے اپنی برباد و ناکام زندگی کا حاصل سمجھ کے تقدیر پر شاکر ہو گئی۔ اپنے ہمسایوں سے اس نے یونہی کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنے سسرال کی ناپسندیدہ بہو ہے لہذا اس کے شوہر کو اس کے ماں باپ نے روک رکھا ہے لیکن یہ بات وہ ایک تعلیمی ادارے میں تو دوہرا نہیں سکتی تھی۔ جاہل عورتیں اس کے بیان پر ایمان لے آئی تھیں اور اس کی ہمدردی میں اس کے شوہر اور سسرال والوں کو بُرا بھلا کہا تھا۔ یہ بہانہ بھلا ایک تعلیم یافتہ معلم کے ساتھ کیسے چلتا؟

نجانے وہ کب تک کرسی پر پڑی جلتے جہانوں کی سیر یں کرتی رہی۔ ذہن میں کانٹے چبھتے رہے اور آنکھوں سے پگھلا ہوا سیال بہتا رہا۔

پھر وہ ننھے کی آواز پر چونکی!

ممی۔ ممی "وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔"

وہ اسکول والے آئے ہیں۔

اسکول والے۔

ہاں ممی۔! بلاؤں انہیں؟

مگر کون بیٹا؟ میں نہیں سمجھی؟

ممی جعفو نے پوچھا تھا کہ باپ کا نام کیا تھا؟

وہ۔ یہاں؟ میرے گھر پر؟

ہاں ممی۔ میں انہیں لاتا ہوں۔!

ننھا باہر دوڑ گیا، سیما کی نظر الماری کی طرف گئی جس کی چھت پر رکھی ٹائم پیس ساڑھے چار بجا رہی تھی۔

ممی۔!" ننھا کمرے سے چیخا۔

دل میں ہزار طوفان چھپائے بوجھل جسم کو بمشکل گھسیٹتی وہ باہر پہونچی۔

تسلیم محترمہ!"

تسلیم" [illegible] نے خشک لبوں پر

زبان پھیری اور بدقت مسکرائی۔ "تشریف رکھیے
جی!" اس نے ایک کرسی سنبھال لی۔
اسکول کے اس سنجیدہ مزاج اور
نوجوان ٹیچر کو اپنے گھر میں پاکر وہ بے حد گھبرانے
لگی تھی۔ آخر اسے اس کے گھر کا پتہ نشان کیونکر
معلوم ہوا۔

جب چند منٹ کی خاموشی بے تکی ہونے
لگی تو سیما نے کہا "معاف کیجیے۔ میں آپ کی
آمد کی وجہ معلوم نہ کرسکی۔ آپ کو اس گھر کا پتہ۔"
روز ادھر ہی سے گزرتا ہوں محترمہ
اسنے بڑے شائستہ اور مہذب لہجے میں جواب
دیا۔ آج بھی اسکول سے واپسی پر گزر رہا تھا
آپ کے صاحبزادے باہر کھیل رہے تھے۔ وہ
مجھے پہچان کر میرے پاس دوڑے آئے۔ اور
ساتھ چلنے پر اتنا اصرار کیا کہ۔۔ "وہ ہنسنے
لگا۔ بہت ذہین بچہ ہے آپ کا!"

ممی۔ یہ مجھے اپنے اسکول میں لے جائیں
گے نا؟" ننھا بے حد خوش نظر آرہا تھا۔
کبھی ہنس کر ماں کا چہرہ دیکھتا اور کبھی ماسٹر کا۔
ہاں بیٹے ضرور لے چلیں گے۔
اسنے ننھے کو اپنے پاس بلایا اور اس کے
بکھرے بال سنوارنے لگا۔ پھر اسے پچکار کر
پوچھا۔ "تم پڑھنا چاہتے ہو۔ بتاؤ
تمھیں کیا کیا آتا ہے؟"

ممی نے سب سکھا دیا ہے۔" ننھا
بولا اور فر فر اپنا سبق سنا دیا۔ "اے
فار ایپل۔ بی فار برڈ۔ ون ٹو تھری
فور۔ مائی نیم از شکیل۔ لب پہ آتی

ہے دعا بن کے تمنا میری۔ اور۔ اور۔
بس، بس، بس۔" اسنے ہنستے
ہوئے کہا۔ "ہم ضرور آپ کو اپنے اسکول میں
شریک کرلیں گے۔"

مگر،" ننھے شکیل نے اچانک ایجاناں
کے حواسوں سے کے ہیروشیما پر ایٹم بم پھینک
مارا۔ "مگر آپ ممی سے ہمارے باپ کا
نام تو نہیں پوچھیں گے؟"
کیا۔" وہ حیرت سے اسے تکنے لگا۔
شکیل!۔" سیما پسینے پسینے
ہوگئی۔ "یہ کیا بکما رہے ہو؟"
ممی آپ ہی تو کہتی تھیں کہ باپ کا
نام کبھی نہ لینا۔" وہ روہانسا ہوگیا۔
یہ کیا قصہ ہے محترمہ۔ میں کچھ نہیں سمجھا۔
آپ سمجھنے کے لیے کیوں تشریف لائے
سیما ایک بیک بپھر گئی۔ "مجھے ننھے کو نہیں شریک
کرانا ہے۔"
نہیں ممی نہیں۔
آپ چلے جائیے۔"
بہت اچھا۔ میں جا رہا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا
ہوا۔ "لیکن۔ میں آپ کا یہ نامناسب
سلوک کبھی نہیں بھولوں گا۔
مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے
سیما کا ذہن ابھی تک ماؤف تھا۔
میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے اس طرح
بھڑک اٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔" عزیز احمد
نے کہا۔ "اسکول میں بھی آپ نے یہی کیا تھا اور
اب بھی۔۔ خیر۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ اسنے

جھک کر شکیل کا سر سہلایا اور کمرے سے
باہر نکل آیا۔ ننھا شکیل اسکے پیچھے بھاگا
اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔
نہ جائیے۔ نہ جائیے۔ آپ مجھے بہت
اچھے لگتے ہیں۔
بٹیا میں پھر آؤں گا۔
نہیں نہیں! شکیل رونے لگا! سیما
دروازے میں آکھڑی ہوئی۔
میں دیکھ رہا ہوں" عزیز احمد نے اس کے
خیالات پڑھ لیے۔" اس کا رونا آپ کو
گراں گزر رہا ہے۔ آپ شاید اس وقت کو
بھی کوس رہی ہیں جب آپ سوء اتفاق
سے مجھ سے ملی تھیں یا میں ادھر سے گزرا تھا
بس یہ آخری موقع ہے۔ راستے دوسرے بھی
تو ہیں۔"
مجھے افسوس ہے۔ سیما نے مدھم لہجے میں کہا
میں بہت پریشان تھی۔ آئیے۔ اندر بیٹھیے۔
شکیل ہی کی خاطر سہی۔
اسی کی خاطر منظور ہے ورنہ آپ سے
تو ڈر لگنے لگا ہے۔" وہ ہنسنے لگا اور شکیل کے
ساتھ کمرے میں چلا آیا۔ پھر وہ کچن میں چائے
بنانے آئی اور عزیز احمد شکیل سے باتیں کرنے
لگا۔ ناسمجھ بچہ! اتنی جلدی اس سے مانوس
ہوگیا تھا کہ اسے چھوڑنے پر آمادہ ہی نہیں
تھا۔ عزیز احمد بھی اتنی دیر میں اسے چاہنے
لگا تھا۔ وہ بھی تو اپنے بھتیجے کو کتنا چاہتا
تھا۔ لیکن اس کی بے مروت بھابھی اور
بے رحم بھائی اس سے بچے کو جدا کرکے کہیں

اور چلے گئے تھے۔ ہفتوں وہ اس کی یاد
میں رویا تھا۔ اب اسے ایسا لگ رہا تھا
جیسے یہ اس کے بھائی ہی کا بچہ ہو۔ اتنا ہی
پیارا، اتنا ہی معصوم۔ اس کی کھوکھلی
زندگی میں ننھے کا وجود نگینہ کی طرح فٹ ہوگیا
تھا۔

سیما دروازے پر رک گئی۔ اندر
سے چھوٹے بڑے قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں
شکیل بے تکلف باتیں کر رہا تھا۔ عزیز احمد
کے قہقہے رکنے کا نام نہ لیتے۔

اور پھر یہ تو روز کا معمول ہوگیا
صبح کو وہ شکیل کو اپنے ساتھ لے جاتا اور شام
کو اس کے گھر چھوڑ جاتا۔ سیما کو مجبوراً اس کی
خاطر تواضع کرنی ہی پڑتی تھی۔ لیکن وہ عزیز
احمد سے بے تکلف نہ ہوسکی۔ وہ اب
سے برگشتہ رہتی تھی۔ یہ لوگ پہلے یونہی
میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں۔ مسکرا مسکرا
کر لبھاتے ہیں۔ اپنی سادگی معصومیت
اور خلوص کا سکہ بٹھلاتے ہیں اور جب مکھی
جال میں جکڑتی ہے۔ تب ——

سیما کا تن بدن کانپ اٹھتا۔ وہ
زمانہ یاد آتا جب وہ اسلم کے شکنجے میں جکڑ
گئی تھی۔ اُف۔ کتنے امتحانوں سے اسے
گزرنا پڑا تھا۔

ویسے اس نے بخوبی اندازہ لگالیا
تھا کہ عزیز احمد اس سے دوستی کا خواہاں تھا
بے تکلف ہونا چاہتا تھا۔ شاید اسی لیے
وہ دیر تک بیٹھا شکیل سے بے معنی بچکانی باتیں
کیا کرتا۔

سیما چاہتی تھی کہ اس میں کوئی خامی کوئی
نقص تلاش کرکے اس کا یہاں کا آنا جانا بند
کرادے لیکن ابھی تک تو اسے اپنی تلاش میں
کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

وہ بے حد سیدھا سادا اور مخلص
ثابت ہوا تھا۔

سیما خائف تھی کہ پھر سے شکیل کے
باپ کی ہستی موضوع گفتگو بنے گی لیکن عزیز احمد
نے پھر کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا تب وہ بھی کسی
حد تک مطمئن ہوگئی۔ اس نے ڈر کے مارے
عزیز احمد سے یہ تک نہیں پوچھا کہ شکیل کے
اسکول جانے کی نوعیت کیا تھی؟

اتوار کے روز شکیل بے چینی سے
عزیز احمد کا منتظر تھا۔

"آج وہ نہیں آئیں گے بیٹے" سیما
کو شکیل کا اضطراب خائف کر رہا تھا۔

کیوں ممی ۔؟

آج چھٹی ہے بیٹے۔

انہیں بلا لیجیے ممی۔

کیوں۔

کیا میں اچھی نہیں؟

ہاں ممی۔ مگر وہ۔ مجھے چاکلیٹ اور
بسکٹ دیتے ہیں۔

میں بھی تو دیتی ہوں بیٹے۔ کیا ان کے
چاکلیٹ زیادہ مزیدار ہوتے ہیں۔

نہیں ممی۔

تو پھر؟

ممی وہ کہتے ہیں کہ شکیل تم میرے بیٹے بنو
گیا؟

ممی۔ میں اُن کا بیٹا ہوں۔ وہ میرے
ڈیڈی ہیں

شکیل؟ سیما چیخ اٹھی۔

مجھے نہیں معلوم ممی۔ یہ تو میری کلاس کے
دوست کہتے ہیں ممی۔ ڈیڈی کون ہوتا ہے؟"

شکیل کیا تم انہیں۔ انہیں ڈیڈی
کہہ کے پکارتے بھی ہو؟

وہ بہت ہنستے ہیں ممی

کیوں ہنستے ہیں

جب میں انہیں ڈیڈی کہتا ہوں!

تم نے یہ بات مجھ سے کیوں نہ کہی
اب تک!

ڈیڈی نے منع کر دیا تھا

کیا کہا تھا۔

کہا تھا۔ ممی سے نہ کہنا۔ بہت ماریں گی۔

ممی کیا آپ مجھے ماریں گی؟

شکیل میں تمہیں اسکول سے اٹھالوں گی۔

نہ یا ممی نہیں ۔ میں انہیں ڈیڈی کہوں گا۔

وہ بہت اچھے ہیں۔

بکو مت۔ ڈیڈی کے بچے۔" آپے سے
باہر ہو کر سیما نے کہا اور ساتھ ہی اس کا ہاتھ شکیل
کے گال پر اس طرح پڑا کہ وہ چیخ کر ایک طرف
جھک گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

پھر کہے گا انہیں ڈیڈی۔" سیما پاگل سی
ہوگئی۔ بول۔ پھر کہے گا۔ ایک غیر آدمی کو ڈیڈی
سُن لے اچھی طرح۔ تیرا ڈیڈی مرچکا۔ اچھا!

دفعتہً دروازے پر آواز سنائی دی شکیل!"

اور شکیل ماں کے عتاب کی پرواہ کیے بغیر باہر بھاگا۔

تم رو رہے ہو بیٹے؟" عزیز احمد نے اسے گود میں اٹھا لیا۔

وہ سسک سسک کر رونے لگا۔ "ممی نے مارا ہے۔"

کیوں؟

آپ کو میں نے ڈیڈی کہا تھا۔"

اتنی سی بات" عزیز احمد اسے سینے سے لگا لیا۔ اور ہنسنے لگا۔ اچھا آؤ چلو اندر چلیں۔"

اندر مت جائیے۔ ممی آپ کو بھی ماریں گی۔"

میں اتنا بڑا ہوں۔ مجھے کیسے ماریں گی! عزیز احمد نے کہا پھر ہانک لگائی۔ محترمہ سیما کیا۔ میں اندر آسکتا ہوں؟"

سیما نے بے حد بے رخی سے اس کا استقبال کیا اور برہمی سے بولی۔ آپ میرا سکون کیوں ملیامیٹ کرنا چاہتے ہیں؟"

ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ میں صرف شکیل کی محبت سے مجبور ہو کر آتا ہوں۔

اچھی بات ہے۔ آئیے اندر چل کے بیٹھیے میں بھی آپ سے ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

اور جب وہ اندر آ کے بیٹھا تب سیما بھی اس کے پیچھے آئی اور کسی تمہید کے بغیر بولی۔ "عزیز صاحب! کیا یہ بات میرے لیے باعث شرم نہیں ہے کہ شکیل آپ کو ڈیڈی کہہ کے پکارے

وہ بچہ ہے۔ دنیا کو سمجھتا ہے کہ---!

میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ کے دل میں کیا ہے۔" سیما بولی۔ "شکیل کی محبت کا آپ نے بہانہ بنایا ہے۔ آپ کسی اور مقصد کے لیے یہاں آتے جاتے ہیں۔

مجھے غلط نہ سمجھیے۔ سیما۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ مجھے شکیل سے واقعی اتنی ہی محبت ہے جتنی ایک باپ کو اپنے بچے سے ہو سکتی ہے۔

شکیل ہی سے کیوں۔ آپ کے مدرسہ میں اور بچے بھی تو ہیں۔" سیما کے دل کا لاوا بہہ رہا تھا بے تکان۔ یہ غور کیے بغیر کہ اس کے دل کش الفاظ کس طرح عزیز احمد کے قلب و دماغ کے پرخچے اڑا رہے ہیں۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتی تھی اور سیما کا غصہ ابلنے لگتا تھا۔

کیا سب بچے آپ کو ڈیڈی کہہ کے پکارتے ہیں۔ یا آپ نے ایک بے سہارا اکیلی عورت کے احساسات سے کھیلنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ مجھے شرم آتی ہے۔ کوئی سن لے گا تو کیا سوچے گا؟ کیا آپ کو میری بدنامی کا بھی خیال نہیں ہے؟

میں نے آج تک کون سی ایسی بات کی ہے سیما کہ جس سے آپ کی نیک نامی پر حرف آتا ہے" عزیز احمد کی آواز میں درد تھا فریاد تھی مگر سیما نے اس کی پرواہ نہ کی بپھرے جوش میں بولی۔

"مجھے آپ کے اس لب و لہجے سے نفرت ہے۔ آپ مجھے متاثر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں سب جانتی ہوں کہ جب بھی کسی مرد کے دل میں عورت کو برباد کرنے کا خیال آتا ہے وہ بس آپ ہی کا سا انداز گفتگو اختیار کر لیتا ہے۔ مگر مجھے پتہ ہے آپ لوگ کتنے بڑے دھوکے باز، مکار، بے وفا اور کم ظرف ہوتے ہیں۔ عورت کو تباہ کرنے کے بعد اس کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔ مجھے اچھی طرح تجربہ ہے۔ وہ سنگدل، بے رحم اور ہیچ آدمی جس نے مجھے خواہ مخواہ ایک بچے کا تحفہ دیا۔ مجھے کنواری ماں بننے پر مجبور کیا۔ وہ بھی ایسا ہی شیریں زبان اور ہمدرد تھا۔ سمجھے آپ! لہذا مجھے آپ کی ہمدردی اور خلوص کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی محبت کے بغیر بھی ہم زندہ تھے اور آپ کے بعد بھی زندہ رہیں گے۔ براہ کرم آپ چلے جائیے اور پھر کبھی نہ آئیے گا۔ اگر راستے سے بھی نہ گزریے گا۔"

"سیما یہ سب باتیں آپ کی جذباتیت ہیں۔ بیکار ہیں۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ دنیا میں سبھی مرد ایک سے نہیں ہیں۔ میں آپ کا المیہ جانتا ہوں۔ سیما۔ میں اس المناک حقیقت پر پردہ ڈال کر آپ کو ایک اچھی زندگی سے روشناس کرانا چاہتا ہوں... میں بھی دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔ کیا میں اور آپ---

نہیں نہیں" سیما کان بند کر کے چیخ اٹھی۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ آپ چلے جائیے۔ پھر کبھی یہاں نہ آئیے گا کبھی نہیں۔ کبھی نہیں!!

کبھی نہ آؤں!!

کبھی نہ آئیے!!

اچھی بات ہے۔ جیسی آپ کی مرضی۔
میں جا رہا ہوں۔ ویسے آپ کو معلوم ہے۔
ضرورت پڑنے پر میں کہاں مل سکتا ہوں۔
اس نے جھک کر شکیل کے سر پر بوسہ
دیا۔

ایک نظر سیما پر ڈالی۔
اور پھر خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔
ممی۔ شکیل کے رونے کی آواز سناٹے
میں گونج رہی تھی۔
شکیل۔ شکیل انہیں جانے دے بیٹا۔
سیما نے کہا اور پھر وہ بھی رونے لگی۔
شکیل کی زندگی میں ایک خوبصورت
موڑ آ گیا تھا۔ وہاں اسی موڑ سے پرانے ڈھرے
پر چلا گیا اب نہ اسکول تھا نہ اسکے چاہنے والے
ڈیڈی۔ ایک دن ایک رات اس نے انتظار کیا
کبھی بھاگ کے دروازے پر جاتا کبھی کھڑکی سے
سڑک پر دیکھنے لگتا اسے پوری امید تھی۔ اس
کے ڈیڈی ضرور آئیں گے۔ بیچارہ اس لفظ کی
معنویت سے بے خبر تھا مگر سینے والے نے اسے
ایک ایسی محبت دی تھی جو ممی کی محبت سے یکسر
مختلف تھی۔

ممی اس درد دل سمجھنے پر آگاہ نہ تھی۔ ننھے
ننھے جذبات سینے میں دفن ہو گئے۔ اظہار احساس
آتا نہ تھا۔ وہ بستر پر آ لیٹا۔ بڑوں کے انداز
میں گم صم سا۔ سیما نے دیکھا وہ تیز بخار میں تپ
رہا تھا! اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔
ممی۔ وہ کراہ رہا تھا۔ ”ڈیڈی کو
بلا دیجئے۔ وہ کیوں نہیں آتے ممی۔

بیٹے وہ اپنے کون تھے۔
اپنے نہیں تھے تو پھر کون تھے ممی۔
انہیں بلا دیجئے۔
اچھا بیٹے۔ تم یہ دودھ تو پی لو۔
نہیں ممی۔ ان کے ہاتھ سے پیوں گا
ضد نہ کرو بیٹا۔ تمہیں بخار ہے۔
میرے بچے۔ یہ پی لو تو پھر میں انہیں بلاتی
ہوں۔

پہلے بلائیے۔ پھر پیوں گا۔
بچے کی ضد نے سیما کو پریشان کر دیا
رونے کی وجہ سے اس کا بخار اور بڑھ
گیا تھا۔

ممی انہیں بلائیے۔
ممی ان سے کہیئے شکیل کو بخار
آ رہا ہے۔ وہ خود ہی آ جائیں گے۔

اچھا بیٹے اچھا۔
سیما بھاگ کر دروازے پر آئی شاید
ایک دیوانی محبت زنجیر بن کر اسے کھینچ
لائے۔ مگر سڑک بیوہ کی مانگ کی طرح
سونی تھی۔
شکیل پر تیز بخار آندھی بن کر چڑھ
دوڑا۔

پہاڑ سی رات سر پر تھی۔ اکیلا
گھر، بیمار بچہ۔ وہ بھاگ کر ڈاکٹر کو بلا لائی
وہ اس پر جھکا اور شکیل نے اسے دیکھ کر
بے اختیار پکارا۔ ڈیڈی۔ آپ آ گئے۔
پھر ڈاکٹر کی اجنبی شکل پر نظر پڑی اور
وہ سسکیاں بھرنے لگا۔

ممی۔ ڈیڈی نہیں آتے؟
سیما چور بنی کھڑی تھی
کیا بچے کے ڈیڈی۔۔۔؟ ڈاکٹر نے
کچھ پوچھنا چاہا تھا

جی ہاں۔ وہ۔۔ وہ۔ مجھ سے خفا
ہو کے۔ چلے گئے ہیں۔ سیما نے کہا اور
سر جھکا لیا۔

انہیں بلا لیجئے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ یہ
بخار دواؤں سے نہیں جائے گا! بچے کسی کو
ٹوٹ کر چاہتے ہیں تو ان کی جان پر بن جاتی ہے۔ دیر
نہ کیجئے۔ اگر اس وقت ملکی ہو تو اسی وقت
بلا بھیجئے۔ ویسے میں اسے ایک انجکشن دیئے
دیتا ہوں۔ آپ گھبرائیے نہیں۔
میرا بچہ اچھا تو ہو جائے گا ڈاکٹر
صاحب۔ ”سیما کی حلق میں آنسوؤں کی گرہ
بندھ گئی۔

اگر اس کے ڈیڈی آ گئے۔
اور اگر وہ نہ آ سکے۔“ سیما نے
دھڑکتے دل سے پوچھا
اچھا تو ہو جائے گا۔ مگر دیر لگے گی!
ڈیڈی آ جیئے۔۔ ڈیڈی آ جیئے۔
بچہ غفلت میں کراہ رہا تھا۔

بخار بہت تیز ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔
اس کی اور سیما کی نظریں ملیں۔ ڈاکٹر نے ہمدردی
سے کہا۔ ”اپنے شوہر کی خفگی کا خیال دل سے
نکال دیجئے۔ بچے کی زندگی کی خاطر ان کی موجودگی
بہت ضروری ہے۔“
ممی انہیں بلا دیجئے۔ ممی وہ کیوں نہیں

آتے ؟" شکیل پر غفلت طاری تھی سیما سر پکڑ کر رہ گئی۔ اب اسے اپنی تیز مزاجی پہ افسوس ہو رہا تھا! کاش نہ کرتی اتنی زبان درازی۔

اس کے بیمار بچے کے ساتھ اس رات کی صبح کرنا بڑا دشوار تھا! رہ رہ کر وہ آسمان کی طرف دیکھتی اور زبانِ بے زبانی سے دعا مانگنے لگتی۔ خدا اسے کسی سزا سے بچالے!

عزیز احمد کو بھی قرار نہ تھا۔ اپنے بھتیجے کی جدائی کے بعد اسے شکیل ملا تھا جو ہو بہو اس کے بھتیجے کا سا تھا۔ اسے اس سے محبت تھی۔ ان میں انسانیت کا ناطہ تھا۔

اور یہ ناطہ اُسے کھینچ رہا تھا۔ سیما کی برہمی نے اسے بہت دُکھ دیا تھا۔ وہ گھر میں جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ مگر گلی کے نکڑ پر آکھڑا ہوا۔ اسے اُمید تھی شاید شکیل

کھیلتا ہوا ادھر آجائے۔ شاید وہ اسے دیکھ لے۔ شاید ــــ اس کی دونوں جیبیں چوکلیٹ اور بسکٹ کے پیکٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ جب دیر ہو گئی تو وہ مایوس ہونے لگا۔

خلاف توقع اسے شکیل کے گھر سے ڈاکٹر نکلتا ہوا دکھائی دیا۔

اس کا دل بڑی زور سے دھڑکا۔

آگے بڑھ کر اس نے ڈاکٹر کو روک لیا۔

"اس گھر میں کون بیمار ہے ڈاکٹر صاحب۔" وہ پوچھتے ہوئے جھجک رہا تھا اور کچھ سنتے ہوئے اسے ڈر لگ رہا تھا۔

ڈاکٹر نے مختصر الفاظ میں تفصیل سنادی اور پھر کہا۔ "اگر آپ اس بے چاری لڑکی کے لیے کچھ کر سکتے ہیں تو ضرور کیجئے۔ اس کا شوہر بگڑ کر چلا گیا ہے۔ اس کا بچہ بیمار ہے اور اپنے ڈیڈی کی یاد میں بلک رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بچے اس طرح کسی کی یاد میں ہٹر کتے ہیں تو ان کا بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔!

باقی باتیں اس نے نہیں سنیں۔ ڈاکٹر نے اس دیوانے کو حیرت سے دیکھا جو پوری بات سنے بغیر ہی بھاگ گیا تھا۔

سیما آوارہ و سرگرداں بے چین روح کی طرح اسے صحن ہی میں مل گئی۔

"سیما؟" وہ ہانپ رہا تھا "وہ آپ کو یاد کر رہا ہے۔" سیما بخت و اتفاق پر متحیر تھی۔

"شکیل ـــ" عزیز اس پر جھکا! جو کچھ لایا تھا۔ اس کے سرہانے رکھ دیا۔

"ڈیڈی!" شکیل نے آنکھیں کھول دیں۔ "آپ آگئے۔ ڈیڈی ـــ"

اس نے اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ "ڈیڈی اب کہیں نہ جائیے گا۔ کبھی نہ جائیے گا۔"

دونوں گرد و پیش سے بے خبر ہنس ہنس کر رو رو کر باتیں کر رہے تھے شکیل کا بخار کم ہو رہا تھا۔ اس نے سکون سے آنکھیں بند کر لیں اور بے خبر سو گیا۔

سیما ششدر اور دم بخود سی دیکھ رہی تھی عزیز احمد آہستہ سے اٹھا اور مدھم لہجے میں کہا

اب وہ آرام سے سو رہا ہے۔ میں جاتا ہوں۔ صبح کو پھر اسے دیکھنے ــ

"نہیں! ــ" وہ بے ساختہ رو پڑی "وہ آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا اور میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"سیما"

جو کچھ شکیل کہتا ہے۔ وہی آپ کو کرنا پڑے گا!"

"تو کیا"

"مت جائیے ہمیں چھوڑ کر مت جائیے۔"

وہ سسکنے لگی۔ مگر ــ میں خود کو آپ کے قابل نہیں سمجھتی!"

"مکمل انسان وہی ہے سیما جسے اپنی کوتاہیوں کا احساس ہو.... بھول جاؤ اس حادثے کو۔ تمہیں اور مجھے ایک اکائی بن کر اپنے بچے کے لیے جینا ہے۔"

اُس نے سسکیاں لیتے ہوئے اس کے سینے پر سر رکھ دیا!!

افسانہ

وہ ایک شخص

پچھم، پورب، اتر، دکھن — غرض ہر سمت تمہارے تصور کی حدوں تک تمہیں شہباز ہی شہباز ملے گا۔

جو کی روٹیاں، گڑ کا ایک ٹکڑا۔

اور صبح دم بھگوتے ہوئے چنے۔

اطاعت خدا کی، اطاعت شہباز کی، یہ تمہاری سینکڑوں سال کی تاریخ ہے تم جو کھیتوں میں ہل جوتتے ہو، بوائی کرتے ہو، سینچائی کرتے ہو اور کٹائی کرتے ہو۔

تمہارے حصے کی روٹیاں تمہیں مل جاتی ہیں، بقیہ کے متعلق سوچنا تمہارے دائرہ فکر سے خارج ہے

یوں بھی تم جانتے ہو کہ اوپر خدا ہے اور نیچے خدا کا نائب شہباز —

تم اس کے بندے ہو، وہ تمہیں رزق دیتا ہے، تم اس کے بیٹے ہو، اس لئے وہ تمہیں تمہارے حصے کی روٹیاں عطا فرماتا ہے

شہباز کے قلمرو میں ایک سکہ قوت کا اور دوسرا اس فکر کا چلتا تھا۔ کہتے ہیں، فکر کا حصہ قوی تر تھا۔

آبادی میں ایک ہمت نکل آیا۔

"گندم ہوتا ہے۔"

"مقدر"

"تو وہ کہاں جاتا ہے، وہ ہمارے حصے میں کیوں نہیں آتا؟"

"تمہارے باپ نے کبھی یہ سوال نہیں کیا تھا، اور نہ ہی تمہارے دادا اور پردادا نے ان فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع کیا تھا۔"

"تم سچ کہتے ہو، مگر میرے اندر سوالوں کا طوفان اٹھا کرتا ہے۔"

دینی بزرگ کو خبر ملی، وہ اس کے گھر والوں سے کہہ گیا۔

"ہمت گمراہ ہوتا جا رہا ہے، اسے گھر سے باہر نہ جانے دیا کرو، مبادا کوئی اس کی [illegible] دے۔"

تب ہی آبادی کے ایک تعلیمی مرکز میں ایک لڑکے نے دوسرے لڑکے سے پوچھا۔

"ہمت کی بات تم نے سنی؟"

"ہاں میں بھی بہت سے سوالوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں۔"

دوسرے نے کہا "یہ سب دماغی خلل ہے

[illegible]

نا سمجھ ہے — نہ وہ غلط نہ یہ غلط۔ یہ سارے خیالات مفسدانہ ہیں۔ ہمت ایک بے راہ رو فرد ہے۔"

کھیت پر دو مزدور محو گفتگو تھے۔

"ہمت نے یہ سوال بھری آبادی کے درمیان اٹھایا تھا۔"

"خدا جانے ہمت کے یہ سوال کچھ معنی بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔"

"رکھتے ہیں کہنا بھی مشکل ہے اور نہیں رکھتے ہیں کہنا بھی مشکل ہے۔"

پھر یہ کہ ہمت نے ایک ایسے تالاب میں جو دیر سے ساکت و صامت پڑا تھا، چند ایک پتھر پھینک کر اس میں تحرک پیدا کر دیا تھا اور بے شمار لہریں اس کے سینے پر بیدار کر دی تھیں۔

ہمت گھر والوں کو سمجھانے میں کامیاب ہو گیا "میں تو شہباز سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے وہ ہماری زمین پر خدا کا نمائندہ ہے اور جو بات ہماری عقل کی گرفت میں نہ آتی ہو، اسے خدا کا نمائندہ ہی حل کر سکتا ہے۔

وہ آبادی میں گھوم گھوم کر لوگوں سے یہ دریافت کرتا رہا کہ کیا وہ جو ایک فکر کی ہیئت اس کے دماغ میں پیدا ہوئی ہے، وہ اس سے واقف ہیں، اور اگر واقف ہیں تو کیا وہ شہباز کے یہاں چل سکتے ہیں؟

وہ طالب علم — دو کھیت مزدور۔ محل کے دربان نے انہیں روکا تب

ہی کہیں سے شہباز کی آواز آئی ۔ "انھیں آنے
دو ۔" وہ انھیں کہیں سے دیکھ رہا تھا۔
انھوں نے شہباز کو پہلی بار نزدیک
سے دیکھا اور دستور کے مطابق اسے سات بار
کورنش بجا لائے اور نظریں نیچی کئے رہے ۔
"ہوں ۔ کیوں آئے ہو ؟"
مست نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا
نائب خدا ! میرے دل میں ایک سوال دیرسے
کانٹے چبھو رہا ہے "
"میں اس کانٹے کو نکال دوں گا" شہباز
نے اس طور پر کہا، جیسے وہ کانٹا اس کے اپنے دل
میں آچبھا ہو ۔
"بیان کرو"
"ہمارے کھیت سرسبز و شاداب ہیں
ان میں گیہوں ہوتا ہے، گیہوں کی روٹیاں ہوتی
ہیں پر ...."
"تجھے یہ سب کس نے سکھایا؟" شہباز
دھاڑا ۔
"نائب خدا یہ باتیں تو میرے مشاہدے
میں آئی ہیں، جیسے چاند کا ابھرتا ڈوبتا فسوں،
صبح کی بدمست ہوائیں، اور سر شام سورج کا
قتل اور آسمان پر یہاں سے وہاں تک اس کے
لہو کی چھینٹیں ۔"
"تیرے باپ نے کبھی یہ سوال کیا، تیرے
دادا نے، تیرے پردادا نے ۔ تو کیا تاریخ کا
ایک عجوبہ بن کر آیا ہے ؟"
"اس سوال کا جواب نائب خدا ہی دے
سکتا تھا اس لئے ...."

شہباز کی آنکھوں کے لہو بھرے
کٹورے چھلک اٹھے ۔
" ان حرامزادوں کی مشکیں کسو
مست چلایا ۔ لہلہاتے کھیت،
گیہوں کی بالیاں، تنور میں گیہوں کی روٹیاں د
دلواتا ہے ۔"
پھر شہباز نے گرجتے ہوئے اپنے
غلاموں کو حکم دیا ۔ "ان نمک حرام سور کے
بچوں کو ننگا کر کے سامنے کے درخت میں
الٹا لٹکا دو تاکہ میں بھی یہ منظر دیکھ سکوں ۔"
چشم زدن میں یہ سب کچھ ہوگیا ۔
اب ان کی چوتڑوں پر سو سو دُرّے
مارو ۔"
محل کے پاسبانوں نے کبھی شہباز
کو اس قدر برہم نہیں دیکھا تھا ۔ وہ سٹراپ
سٹراپ دُرّے لگا رہے تھے ۔
وہ پانچوں نالہ و شیون کرتے کرتے
اور چیختے چیختے بے ہوش ہو چکے تھے ۔ ان
کے جسم پر جا بجا نیلی لکیریں کھنچ گئی تھیں
اور وہ جا بجا پھٹ گئے تھے اور ان سے
خون رس رہا تھا ۔
تب ہی شہباز نے اپنا داہنا ہاتھ بلند
کیا ۔ "اتار دو انھیں ۔"
ان میں دو طالب تھے ۔ شہباز نے
دیکھا کہ ان کے جسم کی تازہ کھالیں پھڑ پھڑا رہی
ہیں اور ان پر تمام سبز سبزہ اگا ہے ۔
ایسا کہ جانور اس پر منہ مارے ۔
ان دو کو چھوڑ کر دوں کو تم میں سے جو چاہے

اپنے گھر بلائے اور انھیں اپنے تصرف میں رکھے
اور اگر آئندہ کبھی یہ ایسی حرامزدگی کریں تو
پھر انھیں جہنم واصل کر دے ۔"
یہ دو جو کھیتوں پہ کام کرتے ہیں،
ان کے سر مونڈ دیئے جائیں، ان کی زبانیں
کاٹ دی جائیں اور انھیں خصی بنا کر سیاہ خرقہ
پہنا دیا جائے ۔ آج سے یہ محل کے اصطبل کے
گھوڑوں کی لید صاف کریں گے ۔"
" اور یہ نطفۂ حرام ۔" اس نے مست
کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔
" میں اسے معمولی موت نہیں دینا چاہتا
اسے تیس سال کے لیے اندھے مقبرے میں ڈال
دو ۔"
مست نے اندھے مقبرے کا نام سنا
تو ایک برقی رو سی اس کے جسم میں دوڑ گئی ۔
اسی دم مست کے اندر ایک عرفانِ ذات کا
عمل شروع ہو گیا ۔
"مجھے ایک سوال کرنا تھا، میں نے ایک
سوال کر دیا ۔ میرا کام ختم ہو گیا اور اس کام
کے ساتھ ساتھ گویا میں بھی ختم ہو گیا، پر یہ کہ
میں نے ہتھیلی سے پتھر پر ایک نقش بنانے
کا کام شروع کر دیا ہے میری ہتھیلی کے نشان
رہ جائیں گے، یہ کام کوئی اور پورا کرے گا ۔
وہ دو طالب علم بانٹ دیئے گئے دونوں
مزدور ایک کایا پلٹ کے بعد شاہی اصطبل
میں لگا دیئے گئے، اور مست ۔۔۔
اندھا مقبرہ مست سے پہلے کب آباد
ہوا تھا، یہ کسی کو یاد نہیں تھا ۔ محافظ جو

انہیں کشاں کشاں لے جا رہے تھے، وہ بھی یہی سوچ رہے تھے کہ وہ مقبرہ انھوں نے تو اپنے ہوش میں کبھی نہیں دیکھا۔ شاید ان کے پرکھوں نے دیکھا ہو، یا ممکن ہے ان کے پرکھوں کے پرکھوں نے دیکھا ہو۔

ایک چھوٹی سی گول عمارت جو چاروں طرف سے بند تھی، اور جس کے اندر سونے والا کبھی پاؤں پھیلا کر نہیں سو سکتا تھا اور جس کے ایک سرے پر ایک چھوٹا سا مثلث باہر نکلا ہوا تھا۔

"یہ تمہارے بول و براز کے لئے ہے اس کی صفائی باہر سے ہوگی۔

مقبرہ چھ سات فیٹ سے زیادہ اونچا نہیں تھا

مست نے خون بھری آنکھوں سے اس مقبرے کو دیکھا، اسے زمین سے ملی ہوئی ایک دو فیٹ کی لوہے کی ایک کھڑکی دکھائی دی، جس میں ایک زنگ آلود قفل لگا ہوا تھا۔

مست نے سوچا "مجھے ادھر ہی سے داخل کیا جائے گا۔ پھر ایک دیوار میں ایک چھوٹا سا شگاف تھا، ایسا کہ اس میں دیدہ بھی نہ سما سکے۔ شاید سانس کا نظام قائم رکھنے کے لئے۔

تبھی شہباز کا ایک ہرکارہ اس کے لئے ایک جامہ لے آیا۔ تب ہی اس کی کمر کی رسی ڈھیلی کر دی گئی۔ اب دوسری طرف جاؤ اور یہ جامہ پہن لو۔

وہ ننگ دھڑنگ ایک ہاتھ میں پیراہن اور دوسرے میں پاجامے کر آیا تو انھوں نے یہ چیزیں اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"جب تم تیس سال کے بعد رہا ہوگے تو یہ پوشاک تمہیں واپس مل جائے گی۔

مست کو جیسے چپ سی لگ گئی تھی کیا بولے وہ ـــ اسے تو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وقت کا ایک دریا ہے جس کی میعاد تیس سال ہے۔ اس دریا میں گاہے وہ ڈوبتا ہے، گاہے ابھرتا ہے، گاہے ساحل سے لگ جاتا ہے۔ گاہے ساحل سے دور ہو جاتا ہے ـــ مکمل خود فراموشی کا دور ـــ

اس چٹیل اور دور دور تک پھیلے ہوئے میدان میں کسی ذی نفس کا پتہ نہیں تھا تب ہی وہ چھوٹا سا، زمین سے لگا ہوا ڈیڑھ دو فیٹ اونچا دروازہ سخت کوششوں کے بعد کھلا۔ قفل زنگ آلود ہو چکا تھا۔ انھوں نے اسے مٹی کا تیل دے کر بڑی مشکلوں سے کھولا اور باری باری اپنے سر اس کے اندر ڈالے۔ اس میں وقت کی لاشوں کے سڑ گل جانے کی بدبو بسی ہوئی تھی

ان کے دل بھی رنج و غم سے آباد ہوں گے۔ مست آخر ان کی آبادی کا ایک فرد تھا ـــ گھر بار، بال بچوں اور خاندان والا، مگر چہرے سبھوں کے شاداب تھے۔ یہ ایک فن تھا جسے انھوں نے شہباز کے یہاں رہ کر سیکھا تھا۔

مست نے ایک سپاہی سے کہا۔ "میرے بچوں کا خیال رکھنا۔"

اس نے فی الفور اپنے بازو والے کو دیکھا "لفنگے! شہباز کے محل پر چڑھ کر آیا تھا، بھول گیا تھا اپنی اوقات؟"

پھر وہ بیچ والے کے پاس گیا۔ اس نے دونوں طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــ "جیسا بوؤ ویسا کاٹو گے؟"

اور کنارے والے نے کہا "احمق انسان زمین کے سینے پر ایک بوجھ ہوتا ہے۔"

اس کے بعد مست نے خود کو بالکل تنہا محسوس کرتے ہوئے، سامنے کے پھیلے ہوئے چٹیل میدان اور دور دور کے درختوں کو دیکھا، جن سے پرے کھیت کھلیان تھے۔ لہلہاتی فصلیں تھیں۔ اپنے جیسے لوگ، اپنا گھر، بال بچے اور شہباز ـــ

اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اب دنیا چھوڑ رہا ہے اور یہ اندھا مقبرہ فی الواقع اسی کا مقبرہ بن جائے گا اور یہیں سے وہ قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔ اپنے عمل کتاب کے ساتھ ـــ تب ہی اس نے ایک ایسی آہ بھری جو اس وقت بھری جاتی ہے، جب آدمی راضی بہ رضا ہو جاتا ہے۔

وہ اندر چلا گیا۔ پھر اس نے زنگ آلود قفل کے بند ہونے کی آواز سنی ـــ اسی ایک آواز کے ساتھ اس نے سوچا ـــ تین دہائیاں مقفل ہو گئیں ـــ

سپاہیوں کے بوٹ کی آواز دور اور دور ہوتی چلی گئی ـــ

اندھے مقبرے میں وقت کی سڑتی
لاش اور اندھیرے کا سیاہ فام پسینے میں
شرابور جسم مہک رہا تھا۔
دیوار کے شگاف پر نظر پڑی۔ تو
مست نے سوچا کہ یہی ایک شگاف ہے جو باہر
کی دنیا سے اس کا رشتہ باقی رکھتا ہے۔ یہ
ہے تو وہ اس دُنیا کے ایک چھوٹے سے نقطے
کو دیکھ سکتا ہے، اگر یہ بھی نہ ہوتا تو دنیا
ختم ہو چکی ہوتی۔

مقبرے نے گردان شروع کی۔
یہ ایک سکنڈ گذرا۔ مست کو
یوں لگا کہ جیسے کئی گھنٹے گذر گئے۔
یہ ایک منٹ گذرا۔ کئی ایک دن
یہ ایک گھنٹہ گذرا۔ کئی ایک ہفتے
یہ ایک دن گذرا۔ کئی ایک سال گذرے
یہ ایک ہفتہ گذرا۔ کئی ایک
دہائیاں گذر گئیں۔

مست نے سوچا کہ جب ایک سال
گذر جائے گا تو اسے یہ احساس ہوگا کہ کئی
ایک عالم گذر چکے ہیں۔

اور جب شام کے سائے رفتہ رفتہ پھیل
جاتے، تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ میدان
گنگنا رہا ہے، پھر ایسا لگتا کہ کسی قافلے کی
گھنٹیاں بج رہی ہیں، لیکن جب غور کرتا تو وہ
انسانی قدموں کی چاپ ہوتیں جو جلد ہی بوٹ
کی دھمک میں تبدیل ہو جاتیں۔

اس ویرانے میں اسے بوٹ کی گھن گرج
بھی اچھی ہی لگتی۔ اصل میں کسی ذی نفس کی قربت
کا احساس ہی اس کے لیے بہت خوش آئند ہوتا۔

بوٹ بہت کچھ کچل دیتے ہیں، لیکن
پھر سوچو کہ وہ ایک انسان کے پاؤں میں
ہوتے ہیں۔

تب سناٹے کے جگر کو چیرتی ہوئی
ایک آواز آئی۔

"مست ۔۔۔!"

جَو کی چار روٹیاں، گڑ کا ایک ٹکڑا
ایک موم بتی اور ایک مشکیزہ پانی ۔۔۔
مست ان چیزوں کو ایک کونے میں رکھ
دیتا ۔۔۔

"یہ روٹیاں چوبیس گھنٹے ساتھ دیں
گی ۔۔ یہ مشکیزہ بھی چوبیس گھنٹے چلے گا
پیو یا نہاؤ ۔۔ یہ موم بتی بس گھڑی یا
دو گھڑی اور یہ دیا سلائی، جس میں تیلیاں
گن کر دی جاتی ہیں۔"

ویسے روشنی کا یہاں کام بھی کیا ہے
دن کو وہ دیوار کے شگاف سے باہر
کی دنیا کو دیکھتا۔
لق و دق میدان، گھنے درخت۔
مست کے پاس وقت کی کمی نہیں تھی ۔۔ وہ
میدان میں پھیلی ہوئی گھاس کی ایک ایک
پتّی کو گھنٹوں دیکھ سکتا تھا۔ وہ درخت
کے ایک ایک پتے کو گن سکتا تھا ۔۔۔
انھیں ہنستے گنگناتے اور جھومتے دیکھ
سکتا تھا اور ان تک اپنا پیغام بھی پہنچا
سکتا تھا۔

میں اس مقبرے میں محرومیوں کا
شکار ہوں اور تم ۔۔۔۔"

" اندھیرے اُجالے کو دیکھ سکتے ہیں
لیکن اندھیرے اندھیرے کو نہیں دیکھ سکتے
یوں دن کی خوشنما دُنیا رات کو بڑے بڑے
سیاہ دھبّوں والی قبا زیبِ تن کر لیتی ۔۔۔
دن گذر رہے تھے، مگر ایسے کہ ان
پر گذرنے کا گمان تک نہ ہو۔ مست فرش پر
کچھ نشان بناتا، جس سے پتہ چلتا، کہ آج ایک
دن گذرا، آج ایک ہفتہ گذرا، آج ایک
مہینہ، اور ۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔ پھر اسی طرح وہ
سال گذرنے پر کنکریاں اکٹھا کرتا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ وہ
ایک منظر میدان کا، گھاس کی پتیوں کا، جھومتے
درختوں کا، تالیاں بجاتے ہوئے پتوں کا، کھلے
آسمان کا اور پھیلی ہوئی دھوپ کا بے معنی سا
ہونے لگا اور اسے یہ محسوس ہوا کہ جب وہ ان
کی طرف دیکھتا ہے تو وہ دم سادھ کر کھڑے
ہو جاتے ہیں ۔۔ کوئی کچھ نہیں بولتا، کوئی کچھ
نہیں سُنتا ۔۔۔

تب مست کو یہ احساس ہوا کہ یہ
سارے مناظر اس وقت خوشنما لگتے ہیں جب
وہ آدمیوں کے درمیان رہتے ہیں، جن اُن کا
حسن ایک اضافی شئے ہے۔
اس دن محرومی کی ایک نئی لہر نے اس
کے دل پر حملہ کیا۔
جب کچھ نہیں تو پھر میں زندہ کیوں ہوں؟
میرا کیا حاصل ہے؟
یہ مقبرہ زندوں کا مقبرہ کیوں کہلاتا ہے؟

اُسی گھٹن نے پسینے کی تہہ در تہہ پرت
مگر پانی صرف ایک مشکیزہ جسے چلّو میں لے کر
کبھی وہ اپنے سر پر تھپتھپا لیتا اور کبھی سینے اور
بازوؤں پر مل لیتا۔

اس رات پہرے دار آیا تو مست نے
اس سے پوچھا
"پانی کچھ اور مل سکتا ہے؟"
دوسرے دن یہ خبر ملی کہ شہباز کی
سالگرہ کے دن ایک فاضل مشکیزہ ملے گا۔
مست کا جی خوش ہو گیا۔
اتنے میں مست نے حساب کیا تو سرد رُتوں
کے دن قریب آ گئے تھے، دوسرے دن اس کی تصدیق
یوں ہو گئی کہ اس کے لیے دو کمبل آ گئے۔
اس تجربے میں مست کبھی کبھی
چیخ اٹھتا۔

کیا حاصل اس زندگی کا؟ یہاں سے
اگر زندہ نہیں نکل سکتے تو مر ہی کر نکل جائیں۔
اس سلسلے میں اس نے بہت کچھ سوچا
تھا، اور آخر میں یہ ترکیب اس کے ذہن میں
آئی تھی کہ، وہ خود کو کمبل میں لپیٹ کر کمبل کو
موم بتی کی لَو دکھا دے۔
لیکن پھر کئی نتیجے سامنے آئے۔ اگر
صرف آدھا سودھا کمبل جلا اور میں نہیں جلا تو
پھر دوسرا کمبل کہاں سے آئے گا؟"
اگر جسم پر صرف زخم آئے اور میں مرنے
سے بچ گیا تو پھر زخم کے لیے مرہم کہاں سے آئے گا؟
اور اگر میں جل کر اس زندگی سے آزاد
ہو گیا تو پھر میری لاش تو ننگی ہو جائے گی۔"

وہ میری ننگی لاش کی تشہیر کریں گے
نہیں۔ نہیں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔
لیکن تب ہی بہت سے سرد سال
بھیانک تنہائیاں، لرزہ خیز بیزاریاں،
اس کی ہمت کے سینے پر بہت سی برچھیاں
کھونپ جاتیں۔ وہ تڑپتا اور ایک
ایک کو نکالتا جاتا۔

چلو، یوں ہی سہی۔
ایک شام پہرے دار کھانا اور پانی کا
مشکیزہ لے کر آیا تو مست نے اس سے کہا
"جی نہیں لگتا، کوئی کام بتاؤ۔"
پہرے دار کچھ نہیں بولا۔ لیکن دوسرے
دن جب وہ کھانا اور پانی کا مشکیزہ لے کر آیا
تو اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا بھی تھا۔
مست نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"
اور جب مست نے تھیلا کو کھولا تو
اس میں مرمت طلب جوتے تھے، ساتھ
میں ایک سُوا، موٹے دھاگے کی ریل اور
موم کا ایک ٹکڑا رکھا تھا۔ مست کی آنکھیں
سُرخ ہو گئیں اور اس نے ایک جوتا کھینچ مارا،
لیکن تب تک پہرے دار اس کھڑکی کو بند
کر چکا تھا۔

دیر تک مست کے سر پر ایک جوئے
خون سی سوار رہی، دیر تک آنکھیں لہو میں
ڈوبی رہیں، دیر تک اس کے دل میں طوفانی
موجیں اٹھتی رہیں اور دیر تک اس کے
دست و بازو میں سنسناہٹ سی رہی۔
اس دن جب یہ بلا خیز موسم گذر گیا
تو ایک بار پھر اس کا جی چاہا کہ اپنے جسم پر کمبل
لپیٹ کر اسے نذرِ آتش کر دے، لیکن یہ
خواہش پھر سارے بھیانک نتیجوں کے ساتھ
سامنے آئی اور بالآخر اسے ایک نیا ادراک
حاصل ہوا کہ انسان کو ہر حال میں اپنے پیاروں
کے لیے جینا چاہیئے۔

اس رات جب مست سویا تو اس
نے خواب دیکھا کہ ایک بے حد گھنا جنگل ہے کہ نہ
اس کی مغرب میں کوئی انتہا ہے نہ مشرق میں، اور
نہ ہی شمال اور جنوب میں، ایسا گھنا جنگل کہ آسمان
سے زمین کی سیڑھیاں بھی اس میں سما نہیں سکتیں۔
اس واسطے اس میں نہ دن کا آفتاب اترتا ہے اور
نہ ہی رات کے ماہتاب کے داخل ہونے کی کوئی
صورت نظر آتی ہے مست دیر تک کھڑا سوچتا
رہا کہ کیا کیا جائے؟ تب ہی کہیں سے ایک
کلہاڑی مل گئی! وہ وہ ایک درخت پر چڑھ کر اس
کی ڈالیاں کاٹنے لگا۔ اس امید پر کہ اگر اس نے
کسی طرح اس گھنے درخت کو کاٹ ڈالا تو شاید
آسمان اپنے زینے لگا کر آفتاب اور ماہتاب کو
وہاں بھیج دے۔

تب دوسرے دن پھٹے جوتوں کا ایک
اور بنڈل آیا۔ پہرے دار نے دیکھا کہ پہلا بنڈل
اسی طرح رکھا ہے۔ اس نے اسی پہلے بنڈل پر ایک
معنی خیز نگاہ ڈالی اور کھڑکی بند کر کے چلا گیا۔
صبح اٹھ کر مست نے جوتوں کے ڈھیر کو دیکھا
پھر سُوا لے کر اسے موم کے جگر میں پیوست کیا۔
اس طرح اس کا [illegible] کچھ سرد ہوا اور پھر اچانک
آپ ہی آپ [illegible] لگا۔ کسی کا منہ کھلا ہوا تھا

کسی کی زبان باہر نکل آئی تھی اور کسی کے پہلو میں نیزے کی ایک دھار لگ گئی تھی۔

تمام دن وہ سر جھکا کر جوتے گانٹھتا رہا اور جب دلیوار کا شگاف اندھیرا اُلنے لگا تو اس نے موم بتی روشن کر دی اور ایک نظر اس جوتے کے ڈھیر پر دوڑائی، جنھیں وہ سی چکا تھا

کسی نے سرگوشیوں میں اس سے پوچھا

کسان کا بچہ جب جوتے گانٹھنے لگے تو کیسا ہوتا ہے؟

اس کا جواب وہ کیا دیتا۔ کچھ عجیب سی بوکھلاہٹ میں اس نے اس آواز کو ہاں، ہوا میں ٹال دیا۔

شام کو جب پہرے دار آیا تو مست نے کہا "یہ سلے جوتے لیتے جاؤ اور اب میرے لیے دو مشکیزے پانی لایا کرو۔ مجھے اس کام کے بعد ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔

اب اُسے شگاف سے باہر کی دنیا کو دیکھنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ وہ ہوتا اور جوتے ہوتے۔ ان جوتوں میں وقت کے قدم ہیں جو آگے ہی بڑھنا چاہتے ہیں۔

آگے اور آگے ـــ

تب ایک دن اس نے محسوس کیا کہ پہرے دار بدل گیا۔ اس نے اس تبدیلی پر کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہیں کیا، کیونکہ اسے سرِ شام جَو کی روٹیاں، گڑ کے ڈھیلے اور دو مشکیزہ پانی بھی مل جاتا تھا اسے زندہ رکھنے کے لئے۔ اور پھٹے جوتوں کا ایک گٹھر وقت کو تیز خرام بنانے کے لئے۔

کب صبح ہوتی، کب دوپہر، کب شام اور کب رات،

اس کی دنیا جوتوں کے ڈھیر میں سمو گئی تھی

وہ وقت کے جوتے بنانے میں منہمک تھا اور وقت تھا کہ اس نے اس کے سر کی سرسبز فصل کو جلا کر خاک کر دیا تھا اور اب اس خاک کو بھی کہیں اُڑا لے گیا تھا۔ اس کے ننگے سر پر میل کے سیاہ دھبے پڑ گئے تھے، جنھیں مست دیکھ نہیں سکتا تھا، محسوس کر سکتا تھا۔

گردن جھکاتے جھکاتے وہ خود بھی کافی جھک گیا تھا۔ اُسے اکثر دن میں بھی موم بتی جلانی پڑتی تھی۔ اب یہ دستور ہو گیا تھا کہ شام کو جب پہرے دار آتا تو مست پہلے اس کے اسی ہاتھ کو دیکھتا جس میں پھٹے پرانے جوتوں کا بنڈل ہوتا۔

پھر ایک دن اس نے محسوس کیا کہ جوتے گانٹھتے وقت آنکھوں کو چاروں سمت سے کھینچنا پڑتا ہے۔

کئی پہرے دار بدلے، کئی زمانہ بدلا۔

بیرونی دنیا کے آئینہ خانے تو کب کے تاراج ہو چکے تھے، اب ایک اندرونی دنیا کا آئینہ خانہ تھا جس میں کبھی کبھار صورت و رنگ کی جلوہ گری ہوتی لیکن زمانہ انھیں بھی تیزی سے مدھم کرتا جا رہا تھا، صورتیں معدوم ہوتی جا رہی تھیں، رنگ اپنی چمک دمک کھوتے جا رہے تھے

تب ایک دن پہرے دار دن کو پہنچ گیا اس کی رہائی کا پروانہ لیکر۔

لیکن مست پر اس خبر کا کوئی ردِّ عمل نہیں ہوا، بلکہ اس وقت بھی اس نے پہرے دار سے وہی ایک سوال کیا۔ "جوتے نہیں لائے؟"

اب جس نے زندگی کے تیس سال دو قدموں کی دنیا میں گزار دیئے تھے، جس نے تین دہائیوں کے پھیلے ہوئے عہد کو دیوار کے ایک چھوٹے سے شگاف کے جلوے میں سمیٹ لیا تھا، اُسے پھر اَن گنت قدموں کی دنیا، بے شمار جلوؤں میں بکھری ہوئی دنیا میں واپس جانا تھا

سب سے پہلے وار تو اس پر چمکتے سورج کا ہوا۔ اسے ایسا لگا کہ اس کی آنکھیں اس تیز روشنی میں جھلس گئیں۔ اس کا سر چکرا گیا اور وہ کچھ دیر کے لیے زمین پر بیٹھ رہا۔

پھر جب ذرا یہ کیفیت کم ہوئی، تو وہ کھڑا ہوا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا پہرے دار کے پیچھے لگ گیا۔

چٹیل میدانوں کی راہ ختم ہوئی تو آبادی آئی۔ خاموش تماشائیوں نے اس مست کو دیکھا جس کی نگاہوں کا آہو کبھی اور وحشت کو نکل چکا تھا، جس کے جسم کی کھالیں خشکی پر اکر بس کوئی دم کی مہمان تھیں، جس کے جسم میں خون کا دریا منجمد سا دکھائی دیتا تھا اور جس کے چہرے پر تین دہائیوں کی خاک کی موٹی موٹی تہیں جم گئی تھیں ـــ

بہت کمزور سا، بہت نحیف سا۔

آبادیوں میں پہنچ کر اس نے پہرے دار سے پوچھا۔ "کہاں؟"

"محل تک" ایک مختصر سا جواب تھا۔

محل کے سامنے میدان میں خلقت کا اژدہام تھا۔ پہرے دار نے اسے صدر میں پہنچا دیا

جہاں اُسے شہباز نظر آیا۔

شہباز کو دیکھ کر اسے ایک پرانا سبق یاد آگیا۔ اور ایک اضطراری حالت میں وہ تین بار جھک کر کورنش بجا لایا۔

شہباز کے باب میں بھی عمر کا سمند تھک چکا تھا، چہرے پہ جھریاں تھیں، سرخی ایسی تھی جو تڑپنا ترک کر چکی تھی اور نگاہوں کی تابندگی ایسی جو جھڑیاں لگانا بھول چکی تھی۔

شہباز نے اسے دیکھ کر کہا۔ "آؤ مست دیکھو میری رعایا تم سے ملنے کے لیے یہاں جمع ہوئی ہے۔"

وہ آنکھیں جن کا آہوئے رمیدہ کسی اور سمت کو نکل چکا تھا، بس ایک منظر پہ جا کر جم گئی تھیں، کہ ایک کثیر مجمع ہے جو حاکم وقت کے حضور میں خاموش سا کھڑا ہے اور یوں لگتا ہے کہ بس اب کچھ ہونے والا ہے، تب ہی ان یخ بستہ آنکھوں نے دیکھا کہ سیاہ خرقے میں ایک شخص کھڑا ہے۔ تاریخ کا ایک ورق بنا۔

لمحے میں شہباز نے اعلان کیا۔

"میرے بچو! یہ مست ہے! تیس برسوں کے بعد آبادی میں واپس آیا ہے تم اس کی باتیں سنو۔"

کوئی ردِ عمل نہیں، کوئی شور نہیں، کوئی گلہ نہیں۔

پہرے دار نے مست کو اسٹیج کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

اس پر شہباز نے گلا صاف کر کے کہا۔ "مست! دیکھو یہ لوگ تمھیں سننے آئے ہیں۔"

پہرے دار نے بھی اُسے ٹھوکا دیا۔

مست بول اُٹھا۔ "جوتا۔ دھاگا سوا۔ موم۔"

پھر وہ چپ ہو گیا۔

کسی نے کہا۔ "آگے بڑھو۔"

مست نے پھر وہی فقرہ دہرایا۔

"جوتا۔ دھاگا۔ سوا اور موم۔"

آواز آئی۔ "یہ کیا رٹ لگا رکھی ہے، آگے بڑھو۔"

مست نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

جوتا۔ دھاگا۔ سوا اور موم۔"

"کیا بکواس لگا رکھی ہے؟"

تبھی ایک جوتا اس کے سر پر آ گرا اور پھر کئی ایک جوتے۔

شہباز کا چہرہ چمک اٹھا، اس نے کھڑے ہو کر خلقت کو خطاب کیا۔

"میرے بچو! یہ وہ تھا جو کبھی سرسبز و شاداب کھیت۔ گیہوں اور گیہوں کی روٹی کی رٹ لگایا کرتا تھا، آج جوتا دھاگا سوا اور موم کی رٹ لگا رہا ہے۔ اسے معاف کر دو۔ یہ تو خدا کا دیوانہ ہے۔"

فلمی ڈائری

آنے والے ایک دو مہینوں میں دو بڑی فلمیں نمائش کے لیے پیش کی جارہی ہیں۔ منوج کمار کی "کرانتی" اور رمیش سپی کی "شان"۔ یہ فلمیں نہ صرف منوج کمار اور رمیش سپی کے وقار کا مسئلہ بنی ہوئی ہیں بلکہ ان سے ملٹی اسٹار اور بڑے بجٹ کی فلموں کا مستقبل وابستہ ہے۔ رمیش سپی کی پچھلی فلم "شعلے" اپنی نمائش کے چھٹے سال میں داخل ہو کر عالمی ریکارڈ قائم کر چکی ہے اور اب ہر بڑے ہندوستانی فلم ساز کی دلی تمنا ہے کہ وہ کوئی ایسی فلم بنائے جو کامیابی کے میدان میں "شعلے" کو پیچھے چھوڑ دے۔ لیکن "شعلے" جیسی فلمیں بنائی نہیں جاتیں بلکہ بن جاتی ہیں۔ اس لئے اب خود اس کے خالق کی "شان" خطرے میں ہے۔ "شان" باکس آفس پر کامیاب بھی ہو جائے تو "شعلے" کی منزل سے آگے بڑھنا بہت مشکل ہے۔ ویسے رمیش سپی کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ "شعلے" سے آگے بڑھ جائیں گے اور ان کا نقشِ ثانی نقشِ اول سے بہتر رہے گا۔ "کرانتی" اور "شان" میں ششی کپور، شترگھن سنہا اور پروین بابی کے نام مشترک ہیں۔ دونوں فلموں کی مہورت ۷۷ء کے آخر میں ہوئی تھی۔ دونوں فلموں کی شوٹنگ ان کے اداکاروں منوج کمار اور امیتابھ بچن کی بیماری کی وجہ سے کافی عرصے تک رکی رہی۔ دونوں فلموں کے کیمرہ مین نریمان ایرانی اور دوارکا دیویچہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں ان کے اسسٹنٹس نے فلموں کی عکاسی کی تکمیل کی ہے اب یہ دونوں فلمیں اگر کوئی غیر متوقع بات نہ ہو تو نومبر یا دسمبر میں تقریباً ایک ساتھ نمائش کے لیے پیش کی جائیں گی۔

"کرانتی" کی کہانی جدوجہد آزادی کے پس منظر میں "امر اکبر انتھونی" ٹائپ کی ہے لیکن یہاں "انتھونی" انگریز ہیں جو ظالم کے دلین ہیں۔ ہیما اور پروین بابی کی تلوار بازی کے ساتھ ساتھ فلم میں بندوقوں، توپوں اور سمندری جہازوں کی لڑائی کے حیرت انگیز مناظر ہیں جنھیں منوج کمار نے اپنے انداز سے پیش کیا ہے۔ "کرانتی" کی سب سے بڑی خصوصیت اور اہم پہلو یہ ہے کہ اس فلم میں دلیپ کمار نے پہلی مرتبہ کیریکٹر رول ادا کیا ہے۔ دلیپ کے کروڑوں چاہنے والوں کو یقین ہے کہ اپنے اس اہم رول کے ساتھ ہندوستان کا مارلن برانڈو اداکاری کی تاریخ میں ایک نئے سنہرے باب کا اضافہ کرے گا۔ "شان" کی کہانی بانڈ کے خالق ایان فلیمنگ کے ناول "ڈاکٹر نو" سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے اس سے پہلے "شعلے" کی کہانی بھی انگریزی فلم DEATH RIDES THE HORSE سے لی گئی تھی۔ رمیش سپی نے پانی کی طرح پیسہ بہایا ہے۔ "شان" اب تک بننے والی ہندی فلموں میں سب سے زیادہ سرمایے والی فلم ہے۔ رمیش سپی اس فلم میں ایک نئے ولن "کل بھوشن" کو پیش کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسے "گبر سنگھ" کی شہرت نصیب ہوگی۔ "کرانتی" کے تقسیم کاروں کو ہر حلقے کے لیے ۶۰ تا ۷۰ لاکھ ادا کرنے پڑ رہے ہیں۔ "شان" کو رمیش سپی اپنے ادارے کے ذریعے ریلیز کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عام تقسیم کار ان کی فلم کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ اگر بدقسمتی سے یہ فلمیں باکس آفس پر ناکام ہو جائیں تو نہ صرف ملٹی اسٹار فلموں کے رجحان پر برا اثر پڑے گا بلکہ فلم انڈسٹری ایک طرح کے مالی بحران کا شکار ہو جائے گی کیونکہ ان فلموں کی تیاری کے لیے بے حساب سرمایہ مارکٹ سے قرض کے طور پر لیا گیا ہے۔ اب یہ مستقبل ہی بتائے گا کہ کامیابی کی دیوی "شان" کا کس شان سے استقبال کرتی ہے اور "کرانتی" کو کس انقلاب سے ہمکنار کرتی ہے۔

★

GUINNESS BOOK OF WORLD RECORDS والوں نے جو دنیا بھر کے ریکارڈوں کا سروے کرتے ہیں ۱۹۷۷ء کے ایڈیشن میں لتا منگیشکر کو دنیا بھر میں سب سے زیادہ گانے گانے والی گلوکارہ قرار دیا تھا۔

اس کتاب میں بتایا گیا تھا کہ لتا نے ۱۹۴۸ء اور ۱۹۷۴ء کے درمیان پچیس ہزار گانے ریکارڈ کرائے ہیں۔ محمد رفیع نے GUINNESS والوں کو جون ۱۹۷۷ء میں ایک شکایتی خط لکھا تھا کہ ان کا سرٹیفکیٹ صحیح اندازے پر مبنی نہیں ہے۔ خط میں کہا گیا تھا کہ محمد رفیع لتا سے چار سال پہلے فلمی دنیا میں داخل ہوئے تھے اور انہوں نے اس وقت تک صرف ۲۳ ہزار گانے ریکارڈ کرائے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ لتا نے جونیئر ہونے کے باوجود ان سے زیادہ گانے گائے ہیں۔ اس خط میں لتا منگیشکر کے اس دعویٰ کی بھی تردید کی گئی تھی کہ وہ عام طور پر ہر روزہ گانے ریکارڈ کراتی ہے۔ محمد رفیع نے بتایا تھا کہ یہ بات انسانی قوت سے باہر ہے کہ کوئی گلوکارہ ہر روزہ گانے ریکارڈ کرائے۔ محمد رفیع کو GUINNESS والوں کی طرف سے جواب وصول ہوا تھا کہ خود لتا منگیشکر نے ۲۵ ہزار گانے ریکارڈ کرانے کا دعویٰ نہیں کیا تھا بلکہ انہیں دوسرے ذرائع سے اس بات کا علم ہوا تھا جسے انہوں نے شائع کر دیا۔ GUINNESS والوں نے محمد رفیع کو یقین دلایا تھا کہ اپنی کتاب کی آئندہ اشاعت کے وقت وہ ان کے اعتراض پر غور کریں گے۔ لیکن GUINNESS والوں نے اپنی بعد کی اشاعتوں میں بھی اسی بات کو دہرایا۔ یہی نہیں بلکہ محمد رفیع کے لیجر کے دو خطوط کا جواب دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔

آخرکار ہندوستان کی مشہور ریکارڈنگ کمپنی پولی ڈار والوں نے GUINNESS کو لکھا کہ لتا منگیشکر کے متعلق ان کا شائع کیا ہوا مواد درست نہیں ہے اور وہ اس سلسلے میں مزید تحقیقات کریں۔ پولی ڈار والوں نے ۵ مئی ۱۹۸۰ء کو یہ خط لکھا تھا لیکن محمد رفیع کے انتقال تک اس کا کوئی جواب وصول نہیں ہوا۔

★

یش چوپڑہ نے اپنی فلم "سلسلہ" کی ہیروئن کے لیے پہلے پونم ڈھلن کو منتخب کیا تھا۔ لیکن فلم کے ہیرو امیتابھ بچن اور پونم کے ستارے نہیں مل سکے۔ اس لیے اُسے کاسٹ سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد یش چوپڑہ کی نظر انتخاب ڈمپل پر پڑی راجیش اور ڈمپل کے اختلافات کے بعد سب سے پہلے یش چوپڑہ نے ڈمپل سے اپنی فلم کے لیے بات کی۔ لیکن امیتابھ چونکہ راجیش اور ڈمپل کے درمیان خلیج کو وسعت دینا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے ڈمپل کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد آج کی مصروف ترین اداکارہ ریکھا کو منتخب کیا گیا جس کے پاس ستمبر ۱۹۸۱ء تک شوٹنگ کے لیے کوئی تاریخ نہیں ہے۔ ریکھا نے نہ صرف ہاں کر دی بلکہ "سلسلہ" کے لیے شوٹنگ کی کچھ تاریخوں کا بھی بندوبست کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی امیتابھ اور ریکھا کے رومانس کا سلسلہ جو کچھ دنوں کے لیے منقطع ہو گیا تھا پھر شروع ہو گیا۔ لیکن اب تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ ریکھا کو "سلسلہ" کی کاسٹ سے نکال دیا گیا ہے وجہ کچھ بھی ہو لیکن امیتابھ بچن کی مرضی کو اس میں دخل نہیں ہو سکتا کیونکہ رومانس کا سلسلہ پوری شدت کے ساتھ جاری ہے۔ کچھ ہی دنوں پہلے ریکھا نے امیتابھ کو زینت سے ٹرنک کال پر بات کرتے پکڑ لیا تھا۔ امیتابھ نے بڑی مشکل سے ریکھا کو سمجھایا، منایا اور اب زینت سے دُور رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔

★

پچھلے دنوں نیتو سنگھ کو لڑکی پیدا ہوئی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہمارے اکثر ہیروئنوں کے ہاں جنہوں نے اپنی زندگی کے ہیرو بھی فلمی دنیا ہی سے چُنے تھے پہلے لڑکیاں ہی پیدا ہوئی تھیں۔ ان میں ڈمپل، ببیتا، جیا بہادری، راکھی اور تنوجہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

★

سعودی عرب کے دولت مند باشندے اپنے دل کی پیاس بجھانے کے لیے اکثر یورپی ممالک کی سیر کرتے ہیں۔ اب شاید انہیں اپنی آنکھوں کی پیاس بجھانے کے لیے بھی اپنے ملک سے باہر جانا پڑے گا۔ کیونکہ سعودی حکومت اب فلموں اور ویڈیو ٹیپس کے لیے بھی اسلامی نکتہ نظر کے مطابق سخت رویہ اختیار کر رہی ہے۔ اب شاید بمبئی میں سعودی کے شیوخ کی آمد پہلے سے بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ کیونکہ

لوگ ہندوستانی فلمیں بڑے شوق سے
یکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک اطلاع کے مطابق سبھی
داس کی فلم "عبداللہ" کی عربی ڈبنگ کے لیے
ملین ڈالر کی پیشکش کی گئی ہے۔

★

فلم "خوبصورت" میں ریکھا کے
داکاری کے اعتبار سے خوبصورت ترین رول
لے بعد اب ہماری چوٹی کی کئی ہیروئنیں رشی کیش
مکرجی کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑ گئی ہیں کہ انہیں
رشی کیش کی آنے والی فلم میں مرکزی رول دیا
جائے۔ اب دیکھئے رشی کیش مکرجی اپنی فلم کے
لیے کس ہیروئن کا ہاتھ پکڑتے ہیں۔

★

جاپان میں ۱۹۴۹ء سے ابتک ۳۱ سال
کے عرصے میں صرف ۸۰۰ فیچر فلمیں بنائی گئیں۔
اب حکومت میں جوان خون کے آنے کے بعد
شاید یہ تعداد بڑھ جائے گی اور جاپان روس سے
اس معاملے میں بھی آنکھ ملانے کے قابل بن جائیگا۔

★

سلیم جاوید کی جوڑی کا جاوید جو اردو
کے مشہور شاعر جاں نثار اختر کا لڑکا ہے۔
اس نے پہلے بھی ایک دو فلمی گانے لکھے تھے اب
وہ کہانی کار کے علاوہ نغمہ نگار بھی ہو گیا ہے
اور یش چوپڑہ کی فلم "سلسلہ" کے لیے اور
ایم۔ ایس سیتو کی فلم "کہاں کہاں سے گذر گئے"
کے لیے گانے لکھ رہا ہے۔

★

وجے آنند کی ملٹی اسٹار فلم "رام بلرام"

ین دھرمیندر اور امیتابھ کے ساتھ امجد خاں
بھی کام کر رہا ہے۔ لیکن وہ اپنے رول سے مطمئن
نہیں ہے کیونکہ آخر مرحلے تک پہنچتے پہنچتے
اس کے رول کو کافی کم کر دیا گیا ہے۔ اس نے
وجے آنند سے درخواست کی ہے کہ اس کا
نام مہمان اداکار کے طور پر دیا جائے۔

دانشور مزاحیہ اداکار گریش کرناڈ
نے فلمی دنیا کی کسی ہیروئن کی بجائے امریکہ میں
مقیم ایک لیڈی ڈاکٹر سرسوتی سے شادی
کر کے اپنے ساتھیوں کو راہ بتائی ہے کہ شادی
کے معاملے میں دانشمندی یہ ہے کہ دل کی
بجائے دماغ کا مشورہ قبول کیا جائے۔

تماشائی

فلمی تبصرہ

تھوڑی سی بے وفائی

کونارک کمبائنز انٹرٹینمنٹ کی فلم "تھوڑی سی بے وفائی" میں اس کے مصنف اور ہدایت کار اسماعیل شراف نے ایک چھوٹی سی لیکن شادی شدہ زندگی کی ایک اہم بات کو افسانہ بنا کر پیش کیا ہے اور اس افسانے میں رنگ بھرنے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باکس آفس نے فلمساز سے بے وفائی نہیں کی ہے اور فلم ہر جگہ کامیاب ثابت ہو رہی ہے

فلم تو عدالت کے سین سے شروع ہوتی ہے یہاں نیما (شبانہ اعظمی) اپنے شوہر ارون (راجیش کھنہ) سے علیحدہ رہنے کا مقدمہ جیت جاتی ہے اور اپنے بیٹے سندو کو بھی عدالت کے حکم کے مطابق اپنے ساتھ ہی رکھتی ہے لیکن اصل کہانی نیما اور ارون کی محبت سے شروع ہوتی ہے محبت کی رنگین وادی کی سیر کے بعد یہ دونوں شادی کر لیتے ہیں اور شادی کے بعد یہ داستاں نہ صرف بے رنگ ہو جاتی ہے بلکہ نیما کی ہٹ دھرمی، ضد اور مشکل فطرت اس کی حیات آفریں فضاؤں میں زہر گھول دیتی ہے۔ ارون اباپ اور ونڈ (ٹے کے۔ ہنگل) ہیروں کا بہت بڑا تاجر ہے۔ جس کے ہاں ہیرے تراشے جاتے ہیں۔ ارون کی غلطی کی وجہ سے تیس لاکھ کا ایک ہیرا ضائع ہو جاتا ہے اور وند اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکا اور دل کے دورے کے بعد بھگوان کو پیارا ہو جاتا ہے اس کے ساتھ ہی امیری کا سورج ڈوب جاتا ہے اور غریبی کے اندھیرے میں ارون کو نہ صرف اپنی بیوی اور بچے بلکہ سوتیلی ماں، بہنوں اور ایک جسمانی اعتبار سے معذور بھائی کے لیے زندگی کے سرد و گرم کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ نیما جس کا باپ سربلند (ڈاکٹر سری رام لاگو) ایک انکم ٹیکس افسر ہے اور جو بہت ناز و نعم سے پلی ہے غربت کے مصائب کو برداشت نہیں کر پاتی اور اپنے سسرال کے ماحول سے دل برداشتہ ہو جاتی ہے۔ اس وقت اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے جب وہ ارون کو ایک حسین لڑکی کے ساتھ دیکھ لیتی ہے، سسرال کو چھوڑ کر میکے چلی جاتی ہے اور اپنے بیٹے سندو کو حاصل کرنے کے لیے عدالت تک پہنچ جاتی ہے۔

اس کے بعد کہانی کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے ارون محنت اور لگن سے کام کرتے ہوئے زندگی کی دوڑ میں غریبی کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے اور امیری کی منزل کو جا لیتا ہے۔ اس درمیان نیما کا باپ رشوت لیتا ہوا پکڑا جاتا ہے۔ نوکری سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے اور پھر زندگی بھی بے وفائی کر جاتی ہے۔ نیما اپنے بھائی کے رحم و کرم پر زندگی گزارتی ہے۔

اب اس پر ارون کی بات کی صداقت ظاہر ہوتی ہے کہ سسرال کے غم بھی میکے کی خوشیوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ارون کا ساتھ چھوڑ کر اس نے زندگی کے سب سے بڑے سہارے سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا تھا وہ اس رشتے کو دوبارہ جوڑنے کے لیے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کا غرور اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا ہے۔ اس عرصے میں سندو ایس ایس سی کا امتحان کامیاب کر لیتا ہے کالج میں شرکت کے لیے بمبئی جاتا ہے اور وہاں اپنے باپ سے بھی ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب ماں اور باپ کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کا سہرا سندو کے سر ہی ہونا چاہیئے۔ چنانچہ وہ ایک حادثے میں زخمی ہو جاتا ہے اور آپریشن تھیٹر کے سامنے اپنے لخت جگر کو زندگی اور موت کی کشمکش میں دیکھ کر ارون اور نیما ماضی کی تلخیوں کو بھول کر اپنے مستقبل کے لیے دُعا کرتے ہیں اور بھگوان ان کی دُعا قبول کر لیتا ہے اس کے ساتھ ہی ارون اور نیما کے درمیان کی خلیج جس کے اطراف کہانی گھومتی ہے ختم ہو جاتی ہے۔

اسماعیل شراف نے نہایت ہی دلکش انداز میں کہانی کو پیش کیا ہے۔ ہدایت کاری بھی بے داغ ہے لیکن بعض کمزور پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ارون کی کرسنا سے ملاقات جو نیما کے بے غلط فہمی کا باعث بنتی ہے ایک کمزور نکتہ ہے جس کے

سہارے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ یہاں اروِن جوکرونا کی مدد کرتا ہے اس کے پس منظر کو بھی ٹھیک سے ESTA B LISH نہیں کیا گیا ہے۔ گیارہ بارہ سال کے بعد جب اروِن اپنے بیٹے کو بیٹے نیما کے یہاں آتا ہے تو اس کا رویہ اس کے کردار سے میل نہیں کھاتا۔ سُریندر کا رشوت لیتے ہوئے پکڑے جانا تو سمجھ میں آتا ہے اور اس طرح اس کے خاندان کا زوال بھی، لیکن اروِن جیسے ذمہ دار آدمی کے ہاتھوں تیس لاکھ کے ہیرے کا لُوٹ جانا بہت زیادہ افسانوی ہے۔ آپریشن تھیٹر کے سامنے جب نندو زندگی اور موت کی کشمکش لیتا ہے اروِن کے منہ سے کہانی کے موضوع سے تعلق رکھنے والے نصیحت آمیز جملے غیر فطری لگتے ہیں۔ نندو کی کالج کے ایک ساتھی کے ساتھ لڑائی شاید اس لیے رکھی گئی ہے کہ لڑائی کا سین ضروری ہے۔ اسی طرح نندو کا اپنے کالج کی ساتھی لڑکی کے ساتھ رومانس بھی کہانی کے مزاج سے میل نہیں کھاتا اس کی وجہ شاید گرپدمنی کو چھوٹی ہے۔

شبانہ اعظمی نے بہت پیارا کام کیا ہے راجیش کھنہ کسی طرح اس سے پیچھے نہیں رہا۔ دوسرے اداکاروں میں ڈاکٹر سری رام لاگو اے کے ہنگل، دیون ورما اور ارملا بھٹ قابلِ ذکر ہیں۔ مکالمے دلچسپ ہیں خصوصاً دیون ورما کے دلکش مکالمے۔ ویسے بعض و... الفاظ کھٹکتے ہیں مثلاً نندو ایک جگہ انکار کرنے کو دھتکارنا کہتا ہے۔ گلزار کے گانے ٹھیک ہیں لیکن خیام کی موسیقی مقبولیت کی سطح تک نہیں پہنچ پائے گی۔ بھوپیندر کا گایا ہوا ایک گانا بہت خوب ہے۔ بلموریا کی فوٹوگرافی منظر نواز ہے۔

مختصر یہ کہ "تھوڑی سی بے وفائی"

نہ صرف آپ کے لیے بلکہ اشتہاری زبان میں آپ کے خاندان کے ہر فرد کے لیے بہت سی دلچسپیوں کا باعث بنے گی۔

ایک بار پھر

"ایک بار پھر" ونود پانڈے کی بنائی ہوئی یہ فلم جو لندن میں فلمائی گئی ہے

ان چند تجرباتی فلموں میں سے ایک ہے جو باکس آفس پر ناکام تجربہ ثابت نہیں ہوتیں۔ "ایک بار پھر" کافی بزنس کر رہی ہے۔ ونود پانڈے نے جو فلم ساز اور ہدایت کار کے ساتھ ساتھ اس فلم کے لیکھک بھی ہیں ایک پیچیدہ موضوع کو جرأت کے ساتھ دلکش انداز میں پیش کیا ہے عورت کے روایتی ہندوستانی روپ کے برخلاف جہاں وہ اپنے پتی کو اپنا بھگوان مانتی ہے اور اس کے چرنوں کو اپنے لیے دھرتی کے سورگ کا درجہ دیتی ہے اس فلم کی ہیروئین (ڈیپتی نیول) جب اپنے پتی مہندر کمار (سُرَیش اوبرائے) کے سرد رویہ کو دیکھتی اور محسوس کرتی ہے تو محبت کی گرمی حاصل کرنے کے لیے ایک آرٹسٹ ومل دیپر دیپ ورما کی باہوں کا سہارا لیتی ہے اور آخرکار پتی کو چھوڑ کر محبوب کو اپنا لیتی ہے موضوع بے حد قدیم ہے لیکن ہمارے ماحول میں کسی قدر نیا لگتا ہے ہمارے ادیب اور ہمارے فلم ساز زندگی کی بعض حقیقتوں کو پیش کرنے کے سلسلے میں بھی بڑی احتیاط سے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ ونود پانڈے نے خوبصورتی کے ساتھ اس موضوع کو پیش کیا ہے لیکن کہانی کی سست رفتاری بعض جگہ تماشائی کو ناگوار لگتی ہے۔ لندن کے ماحول اور مناظر کو ندیم خان کے کیمرے نے بڑی خوبصورتی سے اپنی گرفت میں لیا ہے اور دیکھنے والوں کے لیے جنتِ نظر کی تخلیق کی ہے۔ اداکاروں میں سب سے پہلے سُریش اوبرائے کا نام آتا ہے جس نے ایک ہندوستانی اداکار کے روپ کو حقیقت کا رنگ دیا ہے ڈیپتی نیول کا کردار بھی متاثر کن ہے۔ فلم میں اسے آرٹ اور پینٹنگ کا پرستار بتایا گیا ہے ویسے وہ حقیقی زندگی میں بھی بہت اچھی آرٹسٹ ہے۔ پردیپ ورما میں رومنٹک ہیرو بننے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔

مختصر یہ کہ "ایک بار پھر" صرف ایک بار ضرور دیکھی جا سکتی ہے۔

جواب طلب امور کے لیے جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ کا آنا ضروری ہے تخلیقات کا غیر مطبوعہ ہونا ضروری ہے۔

(ادارہ)

آندھراپردیش ان کے نقش قدم پر چل رہا ہے

یہ آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک اور اکیلے تھے لیکن ہم اپنی بہترین صلاحیتوں اور اپنے مخصوص دائرہ کار کے تحت ہمیشہ ایسی کوشش کرسکتے ہیں۔

آندھراپردیش نے ایسا عمل عیدالفطر کے روز ۱۳ اگسٹ کو کر دکھایا جب چیف منسٹر ایک یادگار عید ملاپ میں اپنے مسلمان بھائیوں سے دوسرے ہندوؤں کے ساتھ شامل ہوئے۔

آندھراپردیش نے دوبارہ ۲۳ ستمبر کو یہ کام کیا جب صرف حیدرآباد میں دس لاکھ سے زائد ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر گنیش مورتیوں کے وسرجن کے دن گنیش تیوہار کی خوشیاں بانٹیں۔ چیف منسٹر نے کئی یہ تھکن لیکن مسرت بخش گھنٹے ان کے درمیان گزارے یہ ایک بے نظیر موقع تھا۔

گاندھی جی نے ہمیں کہا تھا کہ ہم سب خدا کے بچے ہیں۔ آندھراپردیش میں ہم نے اس بات کو اپنے چھوٹے پیمانہ پر ثابت کر دیا ہے۔

اس روایت کو برقرار رکھیے

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
آندھراپردیش

Registered With the Registrar of Newspaper Registered No 8285/64
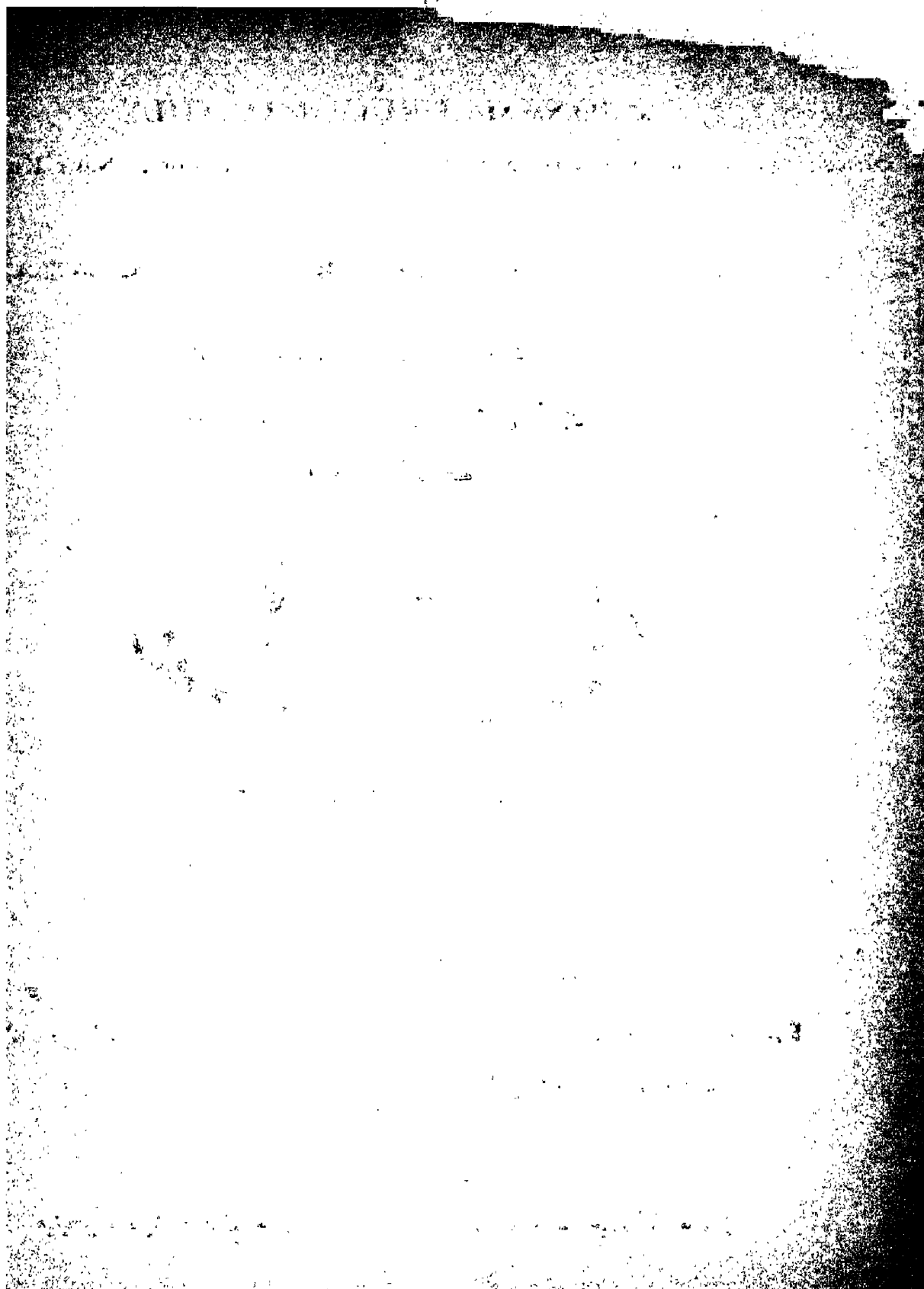
HSE : 6 Phone ; 5295

POONAM URDU MONTHLY

Office : Azampura, Hyderabad-500024 Editor : Nasir Kurnooli, M.A;

November
1980
Rs. 1.50

جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت

علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

خط و کتابت کا پتہ
مینیجر ماہنامہ پُونم ۔ 16-7-300/1
اعظم پورہ ۔ حیدرآباد 24
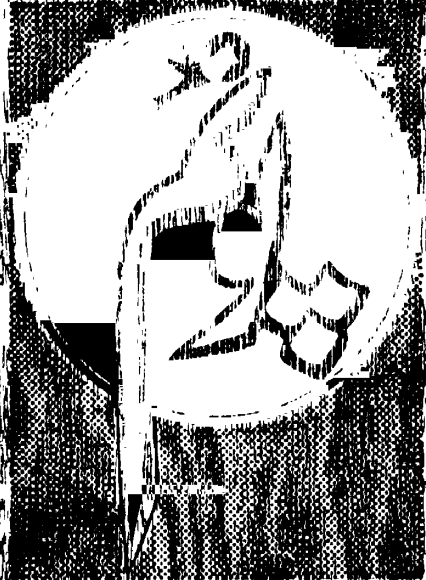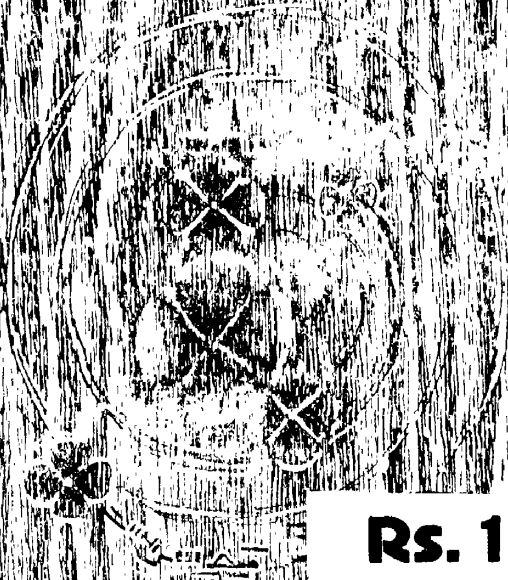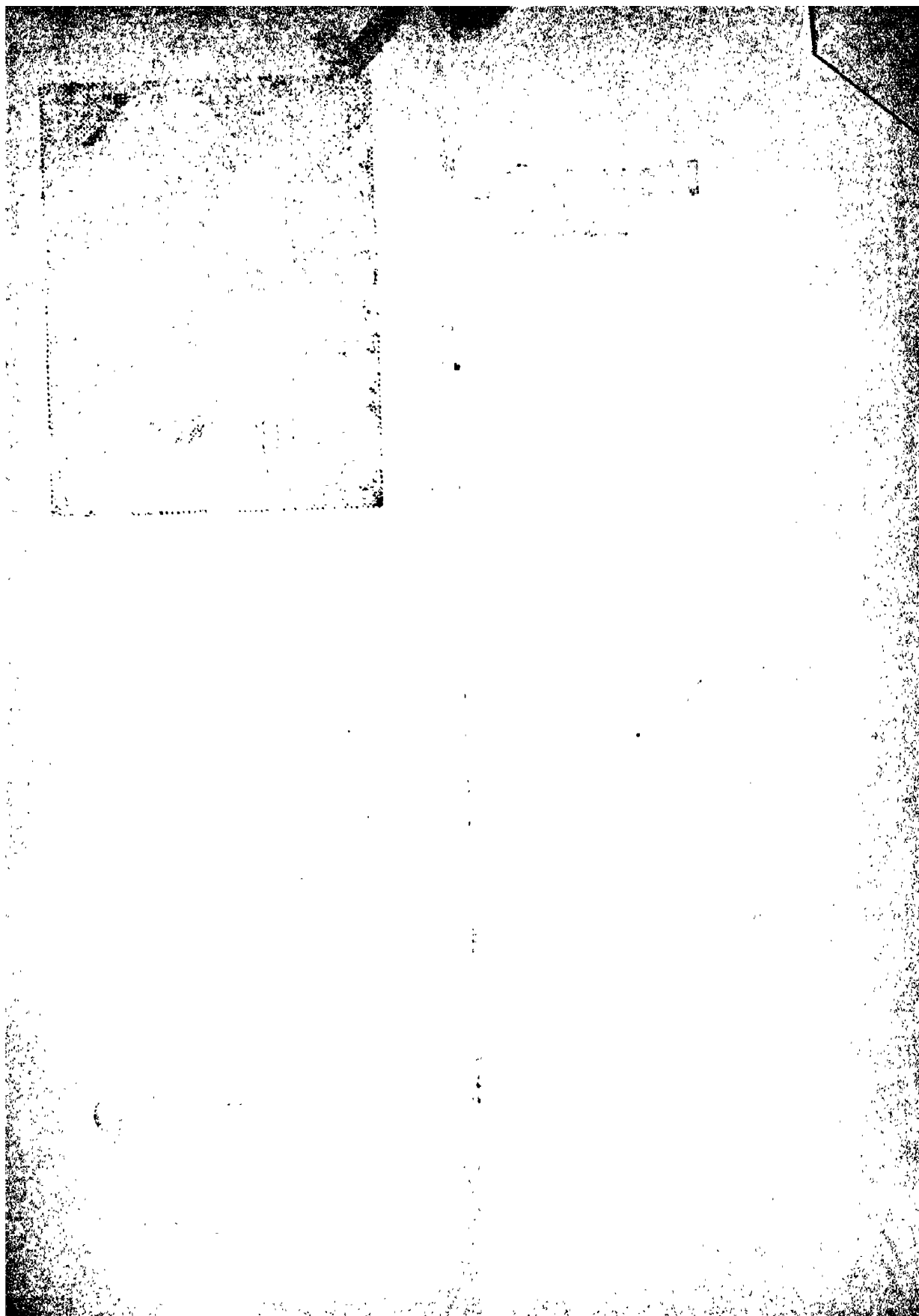
اشاعت کا سولھواں سال
جلد (۱۶)
شمارہ (۱۱)
نومبر ۱۹۸۰ء

زرسالانہ ۲۰ روپے
لائبریز کیلئے ۲۵ "
بیرونی ممالک سے ۳۰ شلنگ
فی شمارہ ۱/۵۰

ترتیب

مطبوعہ :۔ دائرہ الیکٹرک پریس، حسینی بازار، حیدرآباد

عوام کی خدمت کے لیے

★ ایک حقیقی عوامی حکومت
★ صاف ستھرا اور کارکرد نظم ونسق
★ کسی بھی سطح پر بدعنوانی کی گنجائش کے بغیر
★ کسانوں اور صنعتی مزدوروں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ
★ کمزور طبقات کی ترقی کے لئے ترجیحی پروگرام

حکومت آندھرا پردیش نے چیف منسٹر شری ٹی انجیا کی قیادت میں ایک ایسے انتظامیہ کو وجود میں لانے کیلئے ہمہ رُخی مہم شروع کردی ہے جسکا مقصد کام کرنا اور عاجلانہ وفائدہ مند نتائج کا حصول ہے۔

بدعنوانی کیخلاف جنگ اعلیٰ عہدوں پر متعین عوامی شخصیتوں کے خلاف الزامات کی تحقیقات کے لیے لوک ایوکت اور اپلوک ایوکت کا قیام عمل میں لایا جائیگا اس مقصد کیلئے ریاستی مقننہ کے آئندہ اجلاس میں قانون سازی کا اقدام کیا جائیگا۔ بدعنوانی کے سراغ کے لیے ایک فلائنگ اسکواڈ تشکیل دیا جائے گا۔

روشن تر مستقبل وزیر اعظم اندرا گاندھی کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام اور سنجے گاندھی کے ۵ نکاتی پروگرام کی موثر اور با مقصد عمل آوری کے تیقن کے لئے ایک خصوصی شعبہ تشکیل دیا جائے گا۔

کمزوروں کی بھرپور مدد سرکاری اراضیات پر ایک سال سے زائد مدت سے جھونپڑیوں میں رہنے والوں کا تخلیہ نہیں کرایا جائے گا ایسی صورتوں میں جب اراضی سرکاری اغراض کے لیے درکار ہو تو رہائش کا متبادل انتظام کیا جائے گا۔ حکومت ہر مزدور ملازمت سے سبکدوشی کے موقع پر اپنے ذاتی مکان کی فراہمی میں مدد کرے گی۔

مصیبت زدوں کی امداد خشک سالی کے سلسلے میں امداد و تدابیر کی عمل آوری کے لیے ۵ء۲ کروڑ روپے کی رقم منظور کی گئی ہے۔ ضلع سریکا کلم میں سیلاب زدہ عوام کی مدد کے لیے مرکز سے ۵ اکروڑ روپے کی امداد طلب کی گئی ہے۔

قیمتوں کی روک تھام قیمتوں پر کڑی نگرانی رکھی جائے گی۔ غریبوں اور متوسط طبقات کو تاجروں اور مالکین ہوٹل کے استحصال سے محفوظ رکھنے کے لیے اقدامات کئے جائیں گے۔

آندھرا پردیش عظیم کامیابیوں کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے۔ عوام خاص کر کمزور طبقات کی بھلائی کو ترجیح دی جارہی ہے وزیر اعظم اندرا گاندھی کی دعاؤں کے زیر سایہ ہماری ریاست ایک روشن اور خوب تر مستقبل کے یقین کے ساتھ سلور جوبلی سال میں قدم رکھ رہی ہے

جاری کردہ:- ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش

DIPR-L-NO 35275/ADVT/1/C3/80   Dt. 23-10-1980

ایک چراغ اور بجھا......

ساحر لدھیانوی

۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء کی شب کو موت کی آندھی نے اُردو ادب کے ایک اور روشن چراغ کو بُجھا دیا اور ممتاز ترقی پسند شاعر ساحر لدھیانوی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ ساحر کی اچانک موت سے جہاں اردو دنیا ایک منفرد شاعر سے محروم ہو گئی وہیں فلمی دُنیا ایک ایسے گیت کار سے محروم ہو گئی جس کے گیتوں نے نہ صرف مشہور موسیقاروں کی آبرو رکھ لی تھی بلکہ انھیں شہرت کی بُلندیوں پر پہونچا دیا۔ ساحر ہی وہ واحد شاعر ہے جس نے فلمی شاعری کو ادبی آہنگ عطا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ساحر کے گیت فلموں کی میراث ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو ادب کا بھی گرانقدر سرمایہ ہیں۔

ساحر کا اصلی نام عبدالحی تھا جس سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ ۸ مارچ ۱۹۲۱ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والدہ کی سرپرستی میں ہوئی۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخلہ لیا لیکن کمیونسٹ پارٹی کے زیر اثر تنظیم آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستگی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے انھیں کالج سے نکال دیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی کالج کی گولڈن جوبلی کے موقع پر سنہ ۱۹۷۰ء میں ساحر کی خدمات کے اعتراف کے طور پر کالج کی طرف سے گولڈ میڈل عطا کیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں انھیں پدم شری کا اعزاز ملا۔ ۱۹۷۲ء میں حکومت پنجاب نے ساحر کو ریاست کا عظیم ترین ادبی ایوارڈ عطا کیا۔

ساحر کا اولین مجموعۂ کلام "تلخیاں" ان کے زمانۂ طالبعلمی ہی میں شائع ہو چکا تھا اس مجموعے کے اب تک ۲۴ ایڈیشن منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ہندی اور گورمکھی رسم الخط میں بھی اس مجموعے کے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں ساحر کی طویل نظم "پرچھائیاں" کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ یہ نظم عالمی امن کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ تیسرا مجموعہ "آؤ کہ کوئی خواب بنیں" ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا جس پر سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ اردو اکیڈیمی اور مہاراشٹرا اسٹیٹ ایوارڈ پیش کیے گئے۔ ان کے علاوہ ساحر کا ایک اور مجموعہ "گاتا جائے بنجارہ" ہے جو فلمی گیتوں پر مشتمل ہے۔

فلمی دنیا سے وابستگی سے قبل ساحر کئی ادبی رسالوں سے وابستہ رہے۔ ان کے اداریوں، تبصروں اور مضامین نے انھیں ترقی پسند تحریک کے رہنما نقادوں کی صف میں شامل کر دیا۔ ساحر نہ صرف ہندستان کے مقبول ترین شاعر تھے بلکہ عالمگیر شہرت بھی انھیں نصیب ہوئی تھی ان کے کلام کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں ساحر نے حسن و عشق کا موضوع ہو یا انقلاب و بغاوت کا نعرہ اپنے منفرد لہجے میں ایسی شاعری کی ہے جو دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ مظلوموں اور سماج کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کو بغاوت پر اکساتی اور انھیں جینے کا عزم و حوصلہ عطا کرتی ہے۔ ساحر کی آواز ہمیشہ انسانیت کی قدروں کی ترجمان رہی ہے۔ اس آواز کے خاموش ہو جانے سے اُردو شاعری میں جو سناٹا اور خلا پیدا ہو گیا ہے اس کی تلافی بڑی حد تک مشکل ہے۔

ماہنامہ پُونم کو ساحر کا پُر خلوص قلمی تعاون حاصل تھا۔ پُونم کے افرو ایشین رائٹرز نمبر کے تعلق سے ساحر نے جس انداز سے ستائش کی تھی اس کے نقوش بُھلائے نہیں جا سکتے خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا کرے اور ان کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

(ادارہ)

ہمارا نصب العین کسانوں کی بھلائی ہے
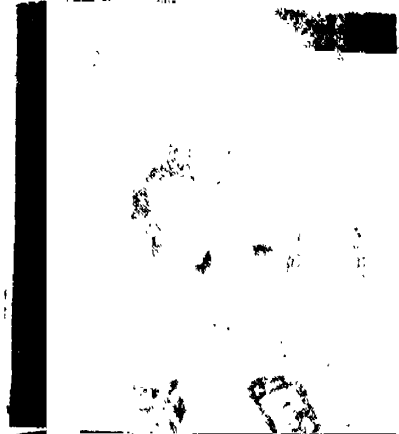
- کسان ہماری معیشت کیلئے ریڑھ کی ہڈی کے مانند ہے۔ وہ زمین سے اناج اُگاکر ہمیں غذا فراہم کرتا ہے۔ چیف منسٹر شری ٹی انجیا کی سرکردگی میں حکومت آندھرا پردیش نے کسانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے بہت سی رعایتیں اور سہولتیں بہم کرنے کا اعلان کیا ہے
- ایسے کسان جن کے پاس پانچ ایکر تری یا دس ایکر خشکی کی حد تک اور اس سے کم اراضیات ہیں یکم جولائی ۱۹۸۰ء سے محصول اراضی کی ادائی سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔
- دھان، جوار اور مونگ پھلی جیسی اہم فصلوں کے لیے بیمہ اسکیم رائج کی گئی
- گنے کی قیمت خرید کو بڑھا کر ۸۵ روپے فی ٹن کر دیا گیا ہے۔ ۸.۵ فیصد سے زائد وصولی کی صورت میں کسانوں کو ۲ روپے فی ٹن تک قیمت ملے گی۔
- ایسی قومی اراضیات پر محصول ترقیات اراضی، خصوصی محصول اراضی اور لازمی محصول آب ختم کر دیا گیا ہے جن پر پانی کی عدم سربراہی کے باعث فصلیں نہیں اُگائی جا سکیں ہیں۔
- کاشت میں استعمال کے لیے تصدیق کئے ہوئے بیجوں پر محصول فروخت برخواست کر دیا گیا ہے۔
- قلیل مدتی اور طویل مدتی قرضوں کے بقایاجات اگر ۳۰ جون ۱۹۸۱ء سے قبل ادا کر دیئے جائیں تو ان پر تاویبی سود معاف کر دیا جائے گا۔
- چھوٹے کسانوں کو دیئے ہوئے طویل مدتی اور قلیل مدتی قرضوں کی میعاد ادائی پر نظر ثانی کی گئی ہے۔
- ۶۵ سال سے زیادہ عمر والے زرعی مزدوروں اور دوسرے بے سہارا ضعیفوں کو شہروں میں ۳۰ روپے ماہانہ، ایک لاکھ سے زائد آبادی والے مقامات میں ۲۵ روپے ماہانہ اور ایک لاکھ سے کم آبادی والے مقامات میں ۲۰ روپے ماہانہ کی شرحوں سے وظائف دیئے جائیں گے۔

جاری کردہ **محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ** حکومت آندھرا پردیش

DIPR/L. NO 37928/ADVT/C1-3/80 Dt. 11-11-80

انگریزی سے ترجمہ
ساجد ساحر شاہ

ساحر امریتا پریتم کی نظر میں

مشہور پنجابی ادیبہ امریتا پریتم کی آٹوبیاگرافی "ریونیو اسٹامپ" کے یہ چند اقتباسات جو انگریزی سے ترجمہ کیے گئے ہیں قارئین پونم کے لیے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوں گے ۔ (ادارہ)

کسی نے ٹیلیفون پر اطلاع دی کہ مجھے "سنہرے خواب" پر اکاڈمی ایوارڈ دیا گیا ہے میں سوچنے لگی اے خدا میں نے سنہرے خواب کسی ایوارڈ کے لیے نہیں لکھے تھے جس شخص نے مجھے متاثر کیا ہے اگر وہ اس کتاب کو نہ پڑھا ہو تو ساری دنیا کے پڑھنے سے کیا فائدہ۔ اسی شام ایک رپورٹر اور ایک فوٹوگرافر میرے پاس آئے اور خواہش کی کہ میں لکھتے ہوئے اخبار کے لیے ایک تصویر کھنچواؤں میں نے اپنے سامنے کاغذ کا ایک صفحہ رکھا ہاتھ میں قلم اور اس شخص کا نام لکھنے لگی جس سے متاثر ہو کر میں نے سنہرے خواب تخلیق کی تھی ساحر۔ ساحر۔ اس کا نام لکھتے لکھتے میں نے صفحہ بھر دیا جب اخبار والے جا چکے تو میں نے تنہائی میں سوچا اگر کاغذ پر ساحر۔ ساحر لکھتے ہوئے فوٹو چھپ جائے گی تو کیا ہوگا۔

چند دنوں بعد میں اور امروز ساحر سے ملے جو اس وقت بیمار تھا جن پیمانوں سے ہم نے شراب پی وہ اس کی میز پر خالی پڑے تھے۔ اسی شام ساحر نے اپنی نظم "میرے ساتھی خالی جام" لکھی اسی رات اس نے ٹیلی فون پر مجھے اپنی نظم سنائی اور ساتھ ہی ساتھ یہ کہتا رہا کہ وہ کس طرح ان تینوں پیمانوں میں شراب انڈیل رہا ہے اور پی رہا ہے

★

دوسری بار ایک دن ساحر میرے گھر آیا تو اس کا جسم بخار سے جل رہا تھا درد سے ٹوٹ رہا تھا اور سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی میں نے اس کی گردن اور سینے پر "وکس" کی مالش کی اس کا جسم یوں سہلاتی رہی جیسے اسی مصروفیت میں اپنی زندگی کے سارے

عورت کو جگا رہا تھا اس وقت میں صرف عورت تھی جس کو کاغذ اور قلم کی ضرورت نہیں۔

★

۱۹۶۰ء کا سال میرے لیے بڑا غمگین تھا بالکل ایسا جیسے کسی کیلنڈر کا نکلا ہوا صفحہ۔ میرا ذہن متزلزل ہو رہا تھا میں کس راستے پر چلوں، اس عالم میں میرا ہاتھ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔ میں ساحر کو ٹرنک کال کرنا چاہتی تھی یکایک میری نظر بلٹز کے ایک صفحے پر پڑی جس پر ساحر اور اس کی ایک نئی دوست کی تصویر چھپی تھی ٹیلی فون سے کئی انچ دور ہی میرے ہاتھ رک گئے۔

★

تقسیم ہند تک جن چیزوں کی میں حفاظت کرنا چاہتی تھی اس میں ساحر کی نظم "تاج محل" بھی تھی جس کو اس نے فریم کروا کر مجھے دیا تھا۔ میرے ذخیرہ میں اس کی اور بھی نظمیں شامل ہیں۔ ذخیرہ میں ٹالسٹائی کی مزار پر گرا ہوا درخت کا ایک پتہ بھی ہے اور اس کے بازو ایک کاغذ ہے جس کی ایک جانب "ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس" اور دوسری جانب ساحر لدھیانوی لکھا ہوا ہے۔ یہ کانفرنس کا بیاج ہے اس کو ساحر نے میرے سینے پر لگا دیا تھا اور میرا بیاج اپنے سینے پر۔ یہ کاغذ کا ٹکڑا میرے ذخیرہ میں ٹالسٹائی کی قبر پر گرے ہوئے پتہ

ایک مشاعرے میں ساحر کے مداحوں کا ہجوم کم ہوا تو میں اس کے قریب گئی اور اپنے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی اس کے آگے پھیلا دی تاکہ اس پر وہ اپنا آٹوگراف دے سکے ساحر نے اپنے انگوٹھے پر قلم کی روشنائی پھیلا دی اور میری ہتھیلی پر اپنے انگوٹھے کا نقش ثبت کردیا بالکل اُن اَن پڑھ لوگوں کی طرح جو دستخط نہیں کرسکتے اور ابہام انگشت لگاتے ہیں کوئی بھی اس آٹوگراف کو نہیں پڑھ سکتا لیکن مجھے یوں معلوم ہوا کہ ساحر میرے رومانٹک تاثرات کا مذاق اڑا رہا ہے

★

میں نے زندگی کا ایک طویل عرصہ محض تصورات کی دنیا میں گذارتی رہی لیکن کوئی بھی خیالی دنیا میں ہمیشہ نہیں رہ سکتا حقائق کا سامنا اس کو کرنا پڑتا ہے اس کا ذکر ایک دن میں نے ساحر سے کرڈالا۔ یہ سُن کر اس کے دل کی کیا کیفیت ہوئی مجھے نہیں معلوم لیکن جواب میں اس نے صرف اتنا کہا۔ تمہارا انتخاب ٹھیک نہیں۔

★

۱۹۶۰ء میں، میں بمبئی میں تھی راجندر سنگھ بیدی روز ملتے تھے ایک دن بیدی نے مجھ سے پوچھا پرکاش پنڈت کہتا ہے ساحر تمہارے لڑکے نورآج کا باپ ہے۔ میں نے اپنی دیوانگی کی ساری داستان انھیں سُنا ڈالی۔ یہ بات تصوراتی طور پر سچ لیکن حقیقتاً غلط تھی نورآج جب ۱۳ سال کا ہوا تو اس نے ایک دن پوچھا "ممی کیا میں تم سے ایک سوال کرسکتا ہوں کیا تم سچ بولوگی؟"

"ہاں"

کیا میں ساحر انکل کا بیٹا ہوں اگر یہ صحیح ہے تو مجھ سے سچ کہو، میں ان کو بے حد پسند کرتا ہوں۔

" میں بھی ان کو بے حد پسند کرتی ہوں لیکن جو کچھ بھی تم نے سُنا اگر سچ ہوتا تو میں تم سے کہہ ڈالتی۔"

میرا لڑکا میری بات سے مطمئن ہوگیا لیکن میں یہ سوچتی رہ گئی کہ تصوراتی سچائی میں بھی کتنی زندگی ہوتی ہے۔

★

لاہور میں ساحر جب کبھی میرے گھر آتا تو خاموش ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ پیتا۔ ایک سگریٹ جلاتا اور ادھ جلے سگریٹ کو بجھا کر دوسرا سگریٹ جلاتا جس وقت وہ اُٹھ کر جاتا تو جلے ہوئے سگریٹوں کا انبار جمع ہو جاتا۔ میں اُس کی موجودگی میں چاہتی تھی کہ اس کے جسم کو چھولوں لیکن ہمت نہ ہوتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں اپنے خیالات کی دنیا میں رہتی تھی جب وہ چلا جاتا تو جلے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں کو جمع کرتی انھیں سُلگا لیتی ان ٹکڑوں کو چھو کر ساحر کی اُنگلیوں کا لمس محسوس کرتی۔ اس طرح میں بھی سگریٹ پینے کی عادی ہوگئی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں میں مجھے ساحر اُبھرتا نظر آتا۔ ان ہی احساسات کو میں نے اپنے ناولٹ 'ایک تھی انیتا' میں پیش کیا ہے مجھے معلوم نہیں ساحر کو پتہ ہے کہ نہیں۔

★

چند سال قبل ساحر سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کے اصرار پر مجھے اس کے ساتھ دو دن رہنا پڑا۔ دہلی واپس ہونے کے بعد میں نے لکھا۔

"یہ عجیب ملاقات تھی مدتوں بعد دو دل ایک ساتھ دھڑکتے رہے۔" ■

ساحر لدھیانوی

پرچھائیاں

(اقتباس)

جوان رات کے سینے پہ دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خوابِ مرمریں کی طرح !
حسین پھول، حسین پتیاں، حسین شاخیں
لچک رہی ہیں کسی جسمِ نازنیں کی طرح
فضا میں گھل سے گئے ہیں افق کے نرم خطوط
زمیں حسین ہے خوابوں کی سرزمیں کی طرح

★

تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح
وہ پیڑ جن کے تلے ہم پناہ لیتے تھے
کھڑے ہیں آج بھی ساکت کسی امیں کی طرح

★

انہیں کے سائے میں پھر آج دو دھڑکتے دل
خموش ہونٹوں سے کچھ کہنے سننے آئے ہیں
نہ جانے کتنی کشاکش سے کتنی کاوش سے
یہ سوتے جاگتے لمحے چرا کے لائے ہیں

★

یہی فضا تھی، یہی رت، یہی زمانہ تھا
یہیں سے ہم نے محبت کی ابتدا کی تھی
دھڑکتے دل سے لرزتی ہوئی نگاہوں سے
حضورِ غیب میں ننھی سی التجا کی تھی

کہ آرزو کے کنول کھل کے پھول ہو جائیں
دل و نظر کی دعائیں قبول ہو جائیں
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
تم آ رہی ہو زمانے کی آنکھ سے بچ کر
نظر جھکائے ہوئے اور بدن چرائے ہوئے
خود اپنے سائے کی جنبش سے خوف کھائے ہوئے
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

★

رواں ہے چھوٹی سی کشتی ہواؤں کے رخ پر
ندی کے ساز پہ ملاح گیت گاتا ہے
تمہارا جسم ہر اک لہر کے جھکولے سے
مری کھلی ہوئی باہوں میں جھول جاتا ہے
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

★

میں پھول ٹانک رہا ہوں تمہارے جوڑے میں
تمہاری آنکھ مسرت سے جھکتی جاتی ہے
نہ جانے آج میں کیا بات کہنے والا ہوں
زبان خشک ہے آواز رکتی جاتی ہے
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

★

مرے گلے میں تمہاری گداز باہیں ہیں
تمہارے ہونٹوں پہ میرے لبوں کے سائے ہیں
مجھے یقیں ہے کہ ہم اب کبھی نہ بچھڑیں گے
تمہیں گمان کہ ہم مل کے بھی پرائے ہیں
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

★

مرے پلنگ پہ بکھری ہوئی کتابوں کو
ادائے عجز و کرم سے اٹھا رہی ہو تم
سہاگ رات جو ڈھولک پہ گائے جاتے تھے
دبے سروں میں وہی گیت گا رہی ہو تم
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

غزل

ساحر لدھیانوی

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

مایوسیٔ مآلِ محبت نہ پوچھیے
اپنوں سے پیش آئے ہیں بیگانگی سے ہم

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

ابھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے
گو دب گئے ہیں بارِ غمِ زندگی سے ہم

گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے
پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم

اللہ رے فریبِ مشیت کہ آج تک
دنیا کے ظلم سہتے رہے خامشی سے ہم

★★★

ساحر لدھیانوی

تاج محل

تاج تیرے لیے اک مظہرِ الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

بزمِ شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی؟
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشاں
اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی؟
مری محبوب پسِ پردۂ تشہیرِ وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا

مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن ان کے لیے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

یہ عمارات و مقابر، یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
سینۂ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور
جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خوں

مری محبوب! انھیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب، یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

مری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

علم خوند میری

رات والا اجنبی

ایک مطالعہ

عوض سعید کے افسانوں کا یہ مجموعہ پندرہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان میں چند افسانے نہایت مختصر اور بعض اوسط حد تک طویل ہیں۔ کم از کم چھ کہانیاں اس قابل ہیں کہ انھیں پچھلے چند برسوں میں لکھی جانے والی معنی خیز اور نمایاں کہانیوں میں شامل کیا جائے۔ عوض سعید کا فن، انتہائی مختصر کہانیوں میں اپنا کمال دکھلاتا ہے اور کم از کم اس مجموعہ کو پڑھنے کے بعد استقرائی طور پر، یہ بات بے جھجک کہی جا سکتی ہے کہ جہاں عوض سعید نے ایک مکمل کہانی لکھنے کی کوشش کی وہاں ایک بلند پایہ افسانہ نویس کی حیثیت سے اپنے فن کو اجاگر نہ کر سکے۔ "مکمل" کہانی سے میری مراد وہ کہانی ہے جو قاری کے ذہن کو کسی قسم کی الجھن میں نہیں ڈالتی، ایسی ہی کہانی دہرائی بھی جا سکتی ہے اور ایک قصے کے طور پر بیان بھی کی جا سکتی ہے اس میں ایک نتیجہ بھی ہوتا ہے اور علت و معلول کا نظام بھی برقرار رہتا ہے۔ ایسی ہی مکمل کہانی پڑھ کر، ایک مہذب قاری یہ فیصلہ صادر کرتا ہے کہ کہانی حقیقی رنگ سے کتنی قریب ہے کسی بھی مقام پر قاری کو تشویش اور کرب سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔

یوں بظاہر عوض سعید کی ایسی ہی مکمل کہانیاں کہانی کہنے کے مروجہ معیار پر پوری اترتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک عام قاری کو، جو سفر کو آسان بنانے کے لیے یا بستر پر تنہا وقت گزارنے کے لیے، افسانوی ادب کا مطالعہ کرتا ہے ایسی ہی مکمل کہانیاں پسند آئیں گی مثلاً وہ رات والا اجنبی کے مقابلے میں سمجھوتہ اور فیری کو پسند کرے گا، جلا وطن کے مقابلہ میں خاک بدل اور غنڈہ اسے پسند آئیں گی۔ جہاں چوتھا آدمی پڑھتے ہوئے اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگی اور اپنے دماغ کی رگوں کو چٹختا ہوا محسوس کرے گا وہیں کفارہ اور وجاہت کے سنگھ پڑھ کر عوض سعید کو دعائیں دے گا، اداس نسل کا آخری آدمی پڑھتے ہوئے شاید وہ کتاب پھینک دینے پر مائل ہو جاتے لیکن صبر کرتے ہوئے جب وہ صلیب اور دل خانہ خراب پڑھے گا تو اس کی برگشتگی تسکین میں اور مصنف سے نفرت، محبت میں بدل جائے گی۔ شاید وہ عوض سعید سے سمجھوتہ کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ بھی کرے لیکن یقین ہے کہ "مردہ گاڑی" اس کو قطعی بے معنی، لغو اور مہمل کہانی نظر آئے گی۔ ایسے اوسط مہذب قاری کا ردعمل یہی ہوگا کہ جدیدیت کی رو نے اپنے پیارے افسانہ نویس کو کس حد تک تباہ یا گمراہ کر دیا۔

مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ اگر اس مجموعہ میں صرف ایسی ہی منفی کہانیاں ہوتیں تو کوئی اردو اکیڈمی اس مجموعے کو انعام کا مستحق قرار نہ دیتی۔ عوض سعید نے شاید اکیڈمیوں کی لاج رکھنے کے لیے مکمل کہانیاں بھی شامل کر دی ہیں۔ اردو کی حفاظت اور بقا کے لیے بہرحال اردو اکیڈمیوں کا وجود ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مکمل کہانیاں درخور اعتنا نہیں۔ بلکہ مواد کے لحاظ سے ان میں حد درجہ انسانیت دوستی ہے اور اس بات کی گواہی بھی ملتی ہے کہ عوض سعید سماجی شعور کا بھی حامل ہے۔ فن کے لحاظ سے ان میں حقیقت پسندی کے معیار کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ بلکہ دو ایک کہانیوں میں حقیقت پسندی، سماجی حقیقت پسندی کے قریب قریب بھی پہونچ جاتی ہے۔

میرا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ایسی مکمل کہانیاں لکھنا تحصیل حاصل ہے، یقیناً ان کا ایک ادبی اور سماجی جواز ہے۔ ایسی ہی کہانیاں ادب کو سماج کے لیے زندہ رکھتی ہیں اور سماج سے ادب کے رشتے کو برقرار بھی رکھتی ہیں لیکن

جہاں سوال جواز کا نہیں معنویت اور نئی فنی ضرورت کا ہو، وہاں ایسی مکمل کہانیاں، ادب کے لیے صرف اعتماد کا ایک موقع فراہم کرتی ہیں اور سفاکانہ طور پر سماج میں زندہ رہنے کے اعتراز کا۔ لیکن ادب اور خصوصاً افسانوی ادب کا ایک رخ، سماج سے رشتہ توڑنے کا بھی ہے اور ہر سماج میں خواہ وہ کتنا ہی آسودہ ہو، کبھی کبھی اگر خاص طور پر نہیں، تو روحانی یا باطنی طور پر رشتہ توڑ لینا پڑتا ہے۔ ایسے ہی ٹوٹتے ہوئے لمحات، ادبی تخلیق کا لمحہ ہوتے ہیں۔ اسی خواب ناک لمحہ، میں راست بیان کی بجائے اشاروں، زندہ استعاروں اور نئی اور پر اسرار، علامتوں کی تخلیق ہوتی ہے۔

زیست کی بے آہنگی اور انتشار ایک ایسے تخیل کو جنم دیتا ہے جس کو بجا طور پر وجودی تخیل EXISTENTIAL IMAGINATION کا نام دیا جا سکتا ہے۔ فرد اور سماج کی بے ربطی اور فرد اور کائنات کے ٹوٹتے ہوتے رشتے ایک اندرونی اور باطنی آہنگ کو پیدا کرتے ہیں اور یہی باطنی آہنگ، فن کا آہنگ اور ربط بن جاتا ہے۔ اس منزل پر فن کی تکمیل کے مروجہ معیارات بے کار ہو جاتے ہیں اور فنی تخلیق کا لمحہ خود اپنا معیار تلاش کر لیتا ہے۔

عوض سعید کی کم از کم چھ کہانیوں یعنی رات والا اجنبی، جلاوطن، چوتھا آدمی، آخری آدمی میں وجودی تخیل کا بھرپور کرشمہ نظر آتا ہے۔ ان کے کردار بھی حقیقی معنوں میں وجودی کردار ہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ وجودی کردار بھٹکا ہوا یا PERVERTED کردار نہیں ہوتا۔ وہ جنسی تسکین کے لیے جنسی معروض کے بجائے جنسی متبادلات کی تلاش نہیں کرتا۔ وہ زیست کے ہنگامے کا ایک ایسا شریک و تماشائی ہوتا ہے جو تمام بنی نوع انسان کے کرب اور اضطراب میں شریک ہوتا ہے۔ ان چھ کہانیوں کے کردار، اسی مفہوم میں وجودی کردار ہیں۔ ان کہانیوں میں ایک امر مشترک ہے ان کے کردار اجنبی ہیں اپنے آپ سے بھی اجنبی اور انسانی کائنات سے بھی گستہ ALIEANATED. ایسے اجنبی کردار اپنی شخصیت کا دوسرا رخ بھی رکھتے ہیں جہاں وہ باطنی طور پر شریک بھی بن جاتے ہیں۔ اسی لیے وہ کردار سے زیادہ غیر کردار اور ہیرو سے زیادہ غیر ہیرو نظر آتے ہیں لیکن وہ جو بظاہر غیر کردار یا غیر ہیرو ہیں دراصل باطنی طور پر انسانی موقف کو بدل دینے کی بے پناہ آرزو اور تمنا بھی رکھتے ہیں ان کی ناکامی یہ نہیں کہ وہ بے حوصلہ ہیں بلکہ ان کی ناکامی کا راز، ان کے اس عرفان میں پوشیدہ رہتا ہے کہ انسانی تاریخ، فرد کی ناکامیوں کی ایک طویل کہانی ہے جب انفرادی حزن تاریخی عرفان سے قریب تر ہوتا ہے

اگر ایک طرف وجودی تخیل، پامال علامتوں اور استعاروں کو رد کرتے ہوئے نئی علامتوں اور استعاروں کو تخلیق کرتا ہے تو دوسری طرف اپنے اور خارجی حقیقت کے فرق اور بعد کو ایک ایسے خالص انفرادی عمل سے رفع کرتا ہے جس میں بظاہر سماجی افادیت نہیں ہوتی لیکن زیست کی سطح پر یہ عمل مکمل اور مستحکم ہوتا ہے مثلاً "رات والا اجنبی" کے آخری جملے

وہ دیوانہ وار سڑک پر بھاگ رہا تھا
ارے اس آدمی کو تو دیکھو سڑک پر کیسے تیز بھاگ رہا ہے جیسے ریل چھوٹنے والی ہو۔

اب سارے لوگوں کی توجہ اسی کی طرف منعطف ہو چکی تھی۔ اب اپنی عقل اور بساط کے مطابق ہر آدمی کوئی نہ کوئی فقرہ کس رہا تھا، یکبارگی اسے ایسے لگا جیسے اس کا بکھرا ہوا وجود تکمیل پا چکا ہو۔"

یہ ایک خود سے اور سماج سے بیگانہ، اجنبی فرد کی کہانی ہے جس نے زیست کی تکمیل کے لیے اپنے لیے ایک رول چن لیا ہے۔ یہ رول اتنا ہی غیر حقیقی ہے جتنا کہ اس کی زندگی، لیکن اسی رول میں اس نے معنویت بھی تلاش کی ہے اور آزادی بھی۔

عوض سعید کو ایسے بے گانہ اور اجنبی کرداروں کا گہرا عرفان حاصل ہے اور اسی لیے وہ ایسی علامتوں اور ایسے استعاروں کی تخلیق پر قدرت

کے تردد کا مکمل اظہار کرتی ہیں "بیگانگی" کی۔
ایک کہانی جلاوطن، اس ہنگامہ خیز جملہ پر
ختم ہوتی ہے۔
"اس نے تکیہ سیدھا کرنے کے لیے
جیسے ہاتھ بڑھایا تو اُسے حیرانی ہوئی کہ آج
غلاف توقع گھڑی بند تھی "۔ جلاوطن خود
ایک علامت ہے سنے دَور کے خود سے
بیگانہ حساس فرد کی۔ یہاں سڑک، آواز اور
گھڑی کی تثلیث جہاں بیگانگی کو اُبھارتی
ہے وہیں اندرونی اور باطنی مصلحت یا
RECONCILIATION کے عمل کی
علامت بھی بن جاتی ہے۔

اسی طرح چوتھا آدمی اپنی بیگانگی کو
ایک عجیب قسم کی پر اسرار انسانی رفاقت کے
ذریعہ دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس
کہانی میں ایک پُر اسرار انسیت HUME-
NATA کی فضا اُبھرتی ہے۔ ایک ایسی
انسیت کی جو سماجی نہیں بلکہ عنصری ہے اور
اس کا آخری جملہ "ارے بھائی یہ تو اپنا
قبرستان نہیں ہے"، جہاں اس عنصری انسیت
کو پارہ پارہ کر دیتا ہے وہیں اس بات کی بھی
شہادت دیتا ہے کہ انسانی تاریخ کے بوجھ
کو اپنے کندھوں سے اُتارا نہیں جا سکتا ہے۔
ایک نوع کی نیلے گائی، بہرحال انسانی مقدر ہے
غیر کردار یا غیر ہیرو کی باطنی امنگ
کا حصہ کا اوپر ذکر ہوا ہے "تثلیث" میں یوں
اظہار ہوتا ہے۔" بوجھ اُٹھانے سے گردن
جھک جاتی ہے۔ اور گردن کا جھک جانا
ندامت کی علامت ہے۔ مگر ہم نے یہ
زہر بھی پی لیا ہے میرے رگ و پے میں
شاید یہی زہر سرایت کر چکا ہے۔"

اداس نسل کا آخری آدمی" میں عوض
سعید نے عصری دنیا کے ان تھکے ہوئے
اور خستہ حال انسانوں کی علامتی تصویر
پیش کی ہے جن پر غالب کا یہ شعر
صادق آتا ہے۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

وہ جو خود سے زیست میں آزادی
حاصل نہیں کر سکتے زیست سے آزادی میں
اپنی تکمیل تلاش کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی
یہ بھی چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا ان کی اس تمنا
کی تکمیل کرے۔

اس مجموعہ کی سب سے کامیاب اور
زندہ کہانی "مردہ گاڑی" ہے جو ایک ایسی
نظم یا مکمل تصویر کی مانند ہے، جس کا تجزیہ
ممکن نہیں ہوتا۔ جہاں افسانہ، شاعری اور
تصویر کشی "مردہ گاڑی" کی علامت میں
متحد ہو جاتے ہیں۔ ایسی کہانی کسی بھی
کہانی کار کی آرزو بن سکتی ہے لانے والی
والا نوجوان ہی اس دَور کا ہیرو ہے جس
پر انسانی نجات کا دار و مدار ہے۔ شاید
یہی فوق البشر بھی ہے اور اقبال کا مردِ مومن
بھی۔ یہی گمنام فرد مستند شخصیت کا
حامل ہے جو امانت اُٹھانے کے لیے تیار
ہے۔ یہاں عوض سعید کا وجودی تخیل اپنے
[illegible] کمال تک پہونچ جاتا ہے۔

عبدالعزیز خالد

چھایا ہے دھواں سا گو ابھی شام نہیں ہے
ہے دل میں وہ غم جس کا کوئی نام نہیں ہے

کس کو نہیں کوتاہیٔ قسمت کی شکایت
کس کو گلۂ گردشِ ایّام نہیں ہے

چھلکوں کے ہیں انبار مگر مغز ندارد
دنیا میں مسلمان تو ہیں اسلام نہیں ہے

مسجد ہو خرابات ہو یا کوئے بُتاں ہو
اس قلبِ تپاں کو کہیں آرام نہیں ہے

اے ماہ وشو، لالہ رُخو وصل کہ ہم کو
خواہش تو ہے بیشک مگر ابرام نہیں ہے

کیفی ہیں مئے نابِ خُمِ مہر شدہ کے
ہم کو طلبِ دُردِ تہِ جام نہیں ہے

ہر بات ہے خالد یوں پسندیدہ و مطبوع
اک پیرویٔ رسم و رہِ عام نہیں ہے

قضا سے قرض کس مشکل سے لی عمرِ بقا ہم نے
متاعِ زندگی دے کر کیا قرضہ ادا ہم نے

ہمیں کس خواب سے للچائے گی یہ پُرفسوں دنیا
کھرچ ڈالا ہے لوحِ دل سے حرفِ مدعا ہم نے

شہیدانِ وفا کی منقبت لکھتے رہے لیکن
نہ کی دارضی خداؤں کی کبھی حمد و ثنا ہم نے

پرکھنے والے پرکھیں گے اسی معیار پر ہم کو
جہاں سے کیا لیا ہم نے جہاں کو کیا دیا ہم نے

وہی انساں جہاں جاؤ، وہی حرماں جدھر دیکھو
بپائے خفتہ کی سیّاحیٔ ملکِ خدا ہم نے

کیا تکمیلِ نقشِ ناتمامِ شوق کی خاطر!
جو تم سے ہو سکا تم نے، جو ہم سے ہو سکا ہم نے

عراقی کی طرح خالد کو کیوں بدنام کرتے ہیں
نہ دیکھا کوئی ایسا خوش نوائے بے نوا ہم نے

اسلم شیخ

آج خلوت میں کس آرام سے باتیں کی ہیں
ہم نے اپنے دلِ ناکام سے باتیں کی ہیں

ہم نے وارفتگیِ شوق میں کیا کچھ نہ کہا
بارہا تیرے در و بام سے باتیں کی ہیں

ہم چٹکتے ہوئے غنچوں کی صدا سنتے ہیں
ہم نے اک شوخ گل اندام سے باتیں کی ہیں

ہم سمجھتے ہیں زمانے کی روش کے تیور
ہم نے اک عمر مے و جام سے باتیں کی ہیں

مے کشی اپنے مقدر میں کہاں تھی اسلم
ہم نے پی کر غمِ ایام سے باتیں کی ہیں

عبداللہ کمال

لہو ٹپک بھی رہا تھا، کوئی مرا بھی نہ تھا
وہاں سے بچ کے نکلنے کا راستہ بھی نہ تھا

وہاں میں درد کے مفہوم کس کو سمجھاتا
میں اجنبی تھا، مجھے کوئی جانتا بھی نہ تھا

کہیں کہیں پہ تھیں روشن دھوئیں کی تحریریں
ابھی تو پوری طرح سے وہ گھر جلا بھی نہ تھا

حصار کھینچ لیا میں نے خود ہی اس حد پر
کہ اس کے بعد مرے سامنے خدا بھی نہ تھا

اٹھا کے تیشہ نئی سمت دی نگاہوں کو
پہاڑ کاٹتے رہنے میں فائدہ بھی نہ تھا

عبدالرحیم نشتر

کیسا جلتا ہوا احساس نوازا مجھکو
جو لبِ جو بھی کھڑا رکھتا ہے پیاسا مجھکو

ہوکے پیروں سے گزرتی ہے تمنا کی فرات
اور ملتا نہیں تسکین کا قطرہ مجھکو

ہر چمکتے ہوئے پیکر پہ نظر جاتی ہے
پاس آئے تو سمندر بھی ہو صحرا مجھکو

اپنی بستی میں تو تذلیل کا احساس بھی ہے
پھر نئی آب و ہوا کا بھی ہے چسکہ مجھکو

کونسے آئینہ خانے میں لے آیا ہے زوال
اپنا چہرہ بھی نہیں لگتا ہے اپنا مجھکو

منظور احمد شیخ

راز

زندگی کے چہرے پر
مفلسی کی کالک ہے
اور چھوٹے سے دل میں
حسرتوں کا ڈیرہ ہے
حسرتوں کے کاندھوں پر
یاس کی صلیبیں ہیں
یاس کی صلیبوں پر
موت کا سناٹا
موت کی فضا میں کیوں
ظلم کا اندھیرا ہے
اور اس اندھیرے میں
روح بلبلاتی ہے
روح کی صداؤں میں
بھوک، درد، عریانی
چیخ کر یہ کہتے ہیں

"ماں ہماری رشوت ہے"
"باپ کالا دھن ہے"

قطب شاہین

ایک آواز ـ سورج

کسی نے بھی دیکھا نہیں اس کو
لیکن
نہاتا رہا بنگالے تالاب میں وہ ـــ
وہ تالاب ہے جس کا بس ایک قطرہ ہی نیلا سمندر ـــ
نہا کر جو اٹھا (تو
چپ بول اٹھی
لگا کام ہونے)
تو لوگوں نے دیکھا
کہا پھر سبھوں نے ایک آواز ہو کر کہ وہ
آگیا آگیا

دیکھو سورج!

فطرت

ننھے ننھے مرے وہ گھروندے
آج تک گن سکا نہ میں جن کو
موج و طوفاں کے لقمے بنے ہیں
اور میں بھی ہوں اک ضدی بچہ
میری فطرت گھروندا بنانا
میں گھروندے بناتا رہا ہوں
اور ہمیشہ بناتا رہوں گا
ریت پر ننھے ننھے سے پیارے پیارے
سمندر کنارے

متھلی نظم
فضل الرحمٰن ہاشمی
مترجم: یوسف جمال

بے چارگی

آہ!
مرا وہ پیارا لڑکپن کہاں جا چکا
گلی ڈنڈے سے زمین اور پتنگ سے آسمان
کا میں فاتح تھا
کھیل کود میں
اس کی تپش سے جسم سیہ سا ہو جاتا تھا
مری ماں منع کرتی تھی
"بیٹے نہ جا
لو لگ جانے کا ڈر ہے"

آج بھی محنت، مزدوری سے بدن سنولایا جاتا ہے
میری ماں بھی بوڑھی ہو گئی
بیوی ـــ اس کی موت کا ہر پل گنتی رہتی
ظلم، یہ سب میں دیکھ رہا ہوں
بھینس سے کچھ کہہ نہیں پاتا ـ
اس وقت جیسے
"راجہ شانتنو" ہوں
"گنگا" سے مجبور ابھی ہوں

★

افسانہ

مصنف GUY GULLING FORD
مترجم: نیلوفر مہدی

(MY UNFAIR LADY)

چشم دید

میں اس وقت درختوں کے جھنڈ میں بیٹھا ایک کتاب کے مطالعہ میں منہمک تھا جب وہ چھوٹی سی لڑکی میرے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ آٹھ نو سال کی عام سے نقش و نگار کی لڑکی تھی جس نے گھٹنوں سے اونچا صاف ستھرا لباس پہن رکھا تھا۔ سر کے بال پونی ٹیل کے انداز میں بندھے ہوئے تھے میں نے نظریں اٹھا کر سرسری انداز میں اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"معاف کرنا مسٹر!" وہ لڑکی مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے بولی۔

"چلو معاف کیا۔ لیکن یہ جنگل کافی وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا ہے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنے لیے کوئی اور جگہ منتخب کر لو۔" میں نے جواب دیا اور دوبارہ کتاب کی طرف دیکھنے لگا لیکن میں محسوس کر رہا تھا جیسے اس لڑکی کی نظریں بدستور میرے چہرے پر جمی ہوئی ہوں۔ اس کی موجودگی میں' میں کتاب پر توجہ نہ دے سکا دوبارہ اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"اچھی لڑکی ہونے کا ثبوت دو اور مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔"

لیکن وہ لڑکی جوں کی توں کھڑی رہی لگتا تھا جیسے وہ اپنے ہی انداز میں سوچنے کی عادی ہو۔ وہ چند لمحوں تک خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

"وہاں۔ اس درخت کے نیچے کوئی آدمی ایک عورت کے ساتھ کچھ زیادتی کر رہا ہے"

"میں یا تم' ان کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتے۔ چلو گھر بھاگ جاؤ۔ شریر کہیں کی!" میں نے غصے میں اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

لیکن میری اس ڈانٹ کا بھی اس لڑکی پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور اسی انداز میں کھڑی خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر کہنی کھجلاتے ہوئے بولی۔

"اگر کوئی تمہارے جسم میں چاقو اتار دے تو تم کیا محسوس کرو گے؟"

"کیا؟" میں کتاب بند کرتا ہوا اچھل کر کھڑا ہو گیا "تم نے پہلے ہی یہ کیوں نہیں بتایا تھا؟"

مجھے آمادہ پا کر وہ تیزی سے میرے آگے آگے ایک طرف چل پڑی۔ تقریباً بیس گز آگے ایک عمودی ڈھلان اتر کر قدآدم جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کو عبور کر کے ہم جیسے ہی درخت کے نیچے پہنچے میں ایک جھٹکے سے رک گیا۔

ایک نوجوان عورت سفیدے کے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ اس کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر چاقو پیوست تھا۔ اسے مرے ہوئے شاید زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش خاصے دلکش تھے اور عمر بھی بیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ لاش دیکھ کر مجھے سینے میں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا میں اس چھوٹی لڑکی کی طرف گھوم گیا جو مجھے یہاں تک لائی تھی۔ لیکن وہ غائب ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دفعتاً مجھے صورت حال کی نزاکت کا احساس ہوا۔

لاش کے پاس میری موجودگی میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی اور وہ شریر بچی میرے لئے ہیرے جواہرات کے ڈھیر سے بھی زیادہ قیمتی تھی۔ کیونکہ وہی اس بات کی واحد گواہ تھی کہ یہ قتل میں نے نہیں کیا تھا۔

چنانچہ مجھے اب سب سے پہلے اس لڑکی کو تلاش کرنا تھا۔ میں درختوں کے درمیان ڈھلان اتر کر اس جگہ پہنچ گیا جہاں ایک چھوٹے سے کھیل کے میدان میں لاتعداد بچیاں کھیل رہی تھیں۔ میری نظریں ادھر ادھر بھٹکتی رہیں مگر وہ مطلوبہ لڑکی کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ میدان کے دو تین چکر لگانے کے بعد میں ایک جگہ رک گیا اور متجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میری پیشانی پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے تھے دل میں عجیب سا خوف بیٹھا جا رہا تھا۔ میری یہ کیفیت مجھے اور بھی مشکوک بنا رہی تھی۔ وہاں کھیلنے والی بچیوں کی مائیں بھی موجود تھیں ان میں سے کسی نے مجھے درختوں کے جھنڈ سے نکلتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا اور اب بچیوں کو اس طرح گھور گھور کر دیکھنا بھی مجھے مشکوک بنا سکتا تھا۔ اتفاق سے میری نظر ایک درخت کے نیچے کھڑے ہوئے پولیس مین کی طرف اُٹھ گئی۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ یہاں سے بھاگ نکلوں مگر اس طرح میں اور بھی شبہ کی زد میں آجاتا چنانچہ میں ایک فیصلے کے تحت پولیس کانسٹیبل کی طرف چل دیا۔

"آفیسر!" میں نے اس کے قریب پہنچ کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں ایک جرم کی اطلاع دینا چاہتا ہوں۔"

پولیس کانسٹیبل بُری طرح چونک گیا وہ ایک نوجوان آدمی تھا۔ ایسا لگا جیسے یہ خبر سنتے ہی اس کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا ہو۔ وہ چند لمحوں تک عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس نے مجھ سے چند سوالات پوچھے اور ہم دونوں درختوں کے اس جھنڈ کی طرف چل دیئے جہاں میں نے اس نوجوان لڑکی کی لاش دیکھی تھی۔ میرا دل اس وقت بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔

لاش دریافت ہونے کے بعد مجھے پولیس اسٹیشن پر کچھ اور پولیس آفیسروں کے سوال جواب کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ پہلے مشترکہ طور پر مجھ سے پوچھ گچھ کرتے رہے وہ شریف لوگ تھے، جنھوں نے میری کہانی پر یقین کر لیا۔ یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ کیونکہ علیحدہ علیحدہ انوسٹی گیشن میں بھی میں نے وہی بیان دہرایا تھا جو حقائق پر مبنی تھا لیکن ایک چیز نے ان لوگوں کو چونکا دیا تھا اور وہ چیز وہ کتاب تھی جو اس وقت میں درختوں کے جھنڈ میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کتاب کے سرورق پر ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کی تصویر تھی جس کے سینے میں عین دل کے مقام پر خنجر پیوست تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ اب تک میں نے سرورق پر توجہ ہی نہیں دی تھی اور میری توجہ پولیس اسٹیشن میں ہی اس تصویر کی طرف مبذول کرائی گئی تھی لیکن یہ اتفاق میرے لئے فوری طور پر زیادہ خطرناک ثابت نہیں ہوا کیونکہ مقتولہ کے جسم، خنجر یا کسی اور جگہ میری انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے اور نہ میرے لباس پر انھیں لڑکی کے سر کا کوئی بال ملا۔ بہر حال۔ وہ چھوٹی لڑکی میرے لیے بہت اہم تھی جس نے مجھے اس دشواری میں مبتلا کیا تھا۔

"کیا تمھیں اس لڑکی کا نام نہیں معلوم؟" انسپکٹر نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"نہیں"۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس لڑکی کو نہیں دیکھا مجھے نام کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر تمھاری کہانی درست ہے تو تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم جلد ہی اس لڑکی کو تلاش کر لیں گے۔

"اگر ایسا ہے تو میرے لیے پریشانی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔"

"خوش قسمتی سے ابھی تک اسکولوں میں چھٹی نہیں ہوئی۔ ہم اسے آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں" سارجنٹ نے ناک کھجلاتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اب تک میری بات کا یقین نہیں کر سکا تھا۔

اگلے چوبیس گھنٹوں میں سارجنٹ کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہو گیا۔ وہ مجھے ساتھ لیے مقامی اسکولوں میں گھومتا رہا۔ بچے جہاں ہماری آمد پر خوش ہوتے وہاں ٹیچرز ہماری اس مداخلت پر ناک بھوں چڑھاتیں۔ بالآخر کئی اسکولوں کو چیک کرنے کے بعد او میگا روڈ گرلز اسکول میں ہماری مراد بر آئی۔

ہیڈ مسٹریس سے مختصر روئیداد بیان کرنے کے بعد ہم نے کلاسز کو چیک کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر ایک کلاس میں وہ لڑکی نظر آ ہی گئی۔ وہ دوسری قطار میں ایک ڈیسک پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہیڈ مسٹریس نے ہمیں پہلے ہی آگاہ کر دیا کہ ہم بچوں کو کسی وجہ سے خوفزدہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔

یت کے پیش نظر سارجنٹ نے لہجے میں
یبدا کرتے ہوئے میری طرف اشارہ
ڑکیوں سے پوچھا کہ کیا ان میں کسی نے
پہلے کہیں دیکھا ہے ؟ اس کے جواب
ری کلاس نے ہاتھ اٹھا دیئے صرف
ڑکی ایسی تھی جس نے ہاتھ نہیں اٹھایا
لڑکی .....

تمام لڑکیاں شور مچا مچا کر کچھ کہنے
نش کر رہی تھیں ۔ ہیڈ مسٹریس
یں خاموش کرایا اور ایک لڑکی کو بات
کو کہا ۔

" میڈیم ! ہم نے اس آدمی کو جنگل
یب کھیل کے میدان میں اس وقت
تھا جب وہاں ایک عورت کو قتل
تھا ۔" لڑکی نے جواب دیا ۔ لڑکی کے
پر ہیڈ مسٹریس نے اس طرح گھور
طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اگر ان
ں میں سے کسی کو نقصان پہنچا تو اس
داری مجھ پر ہی عائد ہوگی ۔ میں اس
نگاہوں کو نظر انداز کرتا ہوا سارجنٹ
ر بلیک بورڈ کی آڑ میں چلا گیا اور
کان میں سرگوشی کرتے ہوئے اسے
جس لڑکی نے ہاتھ نہیں اٹھایا وہی
مطلوبہ لڑکی ہے ۔ وہ مونچھوں پر
یتا ہوا بلیک بورڈ کی آڑ سے باہر
در ہیڈ مسٹریس سے مخاطب ہو کر بولا ۔

" میں دوسری قطار میں بیٹھی ہوئی
ڑکی سے بات کرنا چاہتا ہوں جس نے
ہاتھ نہیں اٹھایا تھا ۔ کیا اس نے پہلے کبھی
اس آدمی کو کہیں دیکھا ہے ؟ "

" بتاؤ روبی ؟ اگر تم نے اس آدمی کو
کہیں دیکھا ہے تو بتاؤ ؟ تمھیں کوئی نقصان
نہیں پہنچے گا ' ہیڈ مسٹریس لڑکی سے مخاطب
ہوئی ۔

وہ لڑکی ڈیسک پر اٹھ کر کھڑی
ہوگئی ۔ چند لمحوں تک خاموشی سے میری
طرف دیکھتی رہی ۔ اس کے چہرے پر کسی
قسم کے تاثرات نمودار نہیں ہوئے تھے ۔
میرا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد وہ بولی ۔

" میں نے اپنی زندگی میں اسے کبھی نہیں
دیکھا مس برک ! میں اس شخص کو قطعی
نہیں جانتی ہوں ۔ "

کلاس روم میں سرگوشیاں ابھرنے
لگیں ۔ اس نے اس طرف توجہ دیئے بغیر نرم
لہجے میں پوچھا ۔

" کیا تم دوسری لڑکیوں کے ساتھ
کھیل کے میدان میں موجود نہیں تھیں ۔"

" نہیں مس برک ! روبی ہمارے
ساتھ نہیں تھی ۔" روبی کے پیچھے بیٹھی
ہوئی ایک اور لڑکی نے جواب دیا ۔

" کیا یہ درست ہے روبی ؟ "

" ہاں مس برک ! فارغ وقت میں
میں اپنے چھوٹے بھائی کو کھلاتی ہوں
تاکہ ممی کچھ آرام کر سکیں ۔"

میں حیرت اور تعجب سے اس
شریر لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا جو میری
موجودگی میں بڑی صفائی سے جھوٹ بول رہی تھی

" میں نے روبی کو کبھی جھوٹ بولتے
ہوئے نہیں سنا ۔ اور میں یقین سے کہہ سکتی
ہوں کہ اس نے اب بھی جھوٹ نہیں کہا
ہیڈ مسٹریس مس برک نے میری توجہ اپنی
طرف مبذول کرائی ۔

سارجنٹ سوالیہ نگاہوں سے
میری طرف دیکھنے لگا لیکن میرے پاس
اس کی ان نگاہوں کا کوئی جواب نہیں تھا ۔

★

میرے خلاف کوئی واضح ثبوت نہ
ہونے کی وجہ سے مجھے چھوڑ دیا گیا ۔ میرے
اور مقتولہ کے درمیان کسی قسم کا کوئی تعلق
بھی ثابت نہیں ہو سکا تھا اور صرف کتاب
کے سرورق کی مطابقت سے کوئی جرم ثابت
کرنا احمقانہ کوشش ہی ہوتی ۔ بہرحال پولیس
نے مجھے بالکل ہی نظر انداز نہیں کیا تھا ۔
میرے بارے میں اب بھی تحقیقات ہو رہی تھیں اور
یہ میرے لیے ایک قسم کا آزمائشی دور تھا ۔ مقتولہ
کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا اور نہ
ہی کسی آدمی سے اس کے کسی قسم کے تعلقات ثابت
ہو سکے تھے ۔ جس چاقو سے اسے قتل کیا گیا
تھا وہ عام نوعیت کا تھا اس قسم کا چاقو کبھی
بھی بوائے اسکاؤٹ کے پاس ہو سکتا تھا
گو اس کی دھار خاص طور سے تیز کی گئی تھی مگر
اس پر کسی کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملے تھے
مقتولہ کی لاش کے آس پاس بھی کسی قسم کا کوئی
نشان دستیاب نہیں ہوا تھا ۔

بالآخر کافی تگ و دو کے بعد جب سی آئی اے بھی اس قتل میں میرا ہاتھ ثابت نہ کر سکی تو آخری مرتبہ مجھے اس طرح باعزت طور پر پولیس اسٹیشن سے رخصت کیا گیا کہ میرے دامن پر کوئی دھبہ نہیں رہا تھا۔ لیکن اس وقت تک میں اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ مالک مکان نے بھی مجھے جواب دے دیا تھا دوست بھی مجھ سے منہ پھیر چکے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اب اس علاقے کی کوئی لڑکی میرے قریب آنے کو تیار نہ تھی بالآخر ایک بوڑھی عورت کے پاس آدھی تنخواہ پر ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی رہائش کا انتظام بھی ہو گیا۔ مگر رہ رہ کر مجھے احساس ہو رہا تھا کہ پولیس اب بھی خفیہ طور پر میری نگرانی کر رہی ہے۔ مجھے تین ماہ تک انتظار کرنا پڑا۔ اور جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب میری نگرانی ختم کر دی گئی ہے تو میں اپنی کارروائیوں میں مصروف ہو گیا۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بچے بہت جلد کسی بات کو بھول جاتا ہے اور اس خیال کے پیش نظر میں نے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اوسیگا روڈ گرلز اسکول کے آس پاس چکر لگانا شروع کر دیئے تین ماہ کا وقفہ خاصا طویل ہوتا ہے لیکن اس روز چار بجے جب اسکول کی چھٹی ہوئی تو میں نے روبی کو فوراً ہی پہچان لیا۔ کچھ دور تک وہ دوسرے بچوں کے ساتھ چلتی رہی پھر ان سے الگ ہو کر اکیلی ایک طرف روانہ ہو گئی یہ میرے لیے ایک اچھا موقع تھا۔ میں کئی روز سے جیب میں ٹافیوں کا پیکٹ ڈالے اس کی تلاش میں گھوم رہا تھا چند قدم چلنے کے بعد ہی میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

"روبی! یہ دیکھو میں تمہارے لئے ٹافیاں لایا ہوں۔" میں نے جیب سے پیکٹ نکالتے ہوئے کہا۔

اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ وہ پہلی نظر میں ہی مجھے پہچان گئی تھی مگر اس کے چہرے سے کسی قسم کے ڈر یا خوف کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

"میری امی کہتی ہیں کہ کسی اجنبی سے کوئی چیز نہیں لینی چاہئیے۔"

"ارے! میں تمہارے لیے اجنبی تو نہیں۔ میں وہی ہوں جسے تم نے تقریباً عمر بھر کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا تھا۔"

"ممکن ہے تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن تمہیں مجھ سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیے۔ اس کے علاوہ ....."

"ہاں! اس کے علاوہ کیا؟"

"میں اپنے آپ کو کسی مصیبت میں نہیں پھنسانا چاہتی اور نہ ہی لوگوں کی توجہ کا مرکز بننا چاہتی ہوں۔"

میں چکرا کر رہ گیا۔ اس چھوٹی عمر میں بھی اس کے ذہن میں ایسی باتیں تھیں۔ ایسے اس امر کی قطعی پروا نہیں تھی کہ مجھ پہ کیا بیتی تھی اسے تو بس یہی فکر تھی کہ وہ کسی معاملے میں ملوث نہ ہو۔ اب مجھے شبہ سا ہونے لگا تھا کہ وہ قاتل کو بھی جانتی تھی لیکن میں نے اس پر اپنے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا اور چند قدم چلنے کے بعد میں نے اچانک پوچھا

اس کا مطلب ہے کہ تم اس شخص کو جانتی ہو جس نے اس لڑکی کو ہلاک کیا تھا۔"

"ہاں۔ ایک طرح سے میں نے اسے دیکھا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی اور وہ عورت پر جھکا ہوا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے تم نے اسے دیکھا تھا کیا اب تم اسے پہچان سکتی ہو؟"

"ہاں۔ اگر میں چاہوں تو ایسا کر سکتی ہوں۔ وہ نیلا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔"

"نیلا سوٹ تو بہت سے لوگ پہنتے ہیں، مگر ....."

"میری ممی کہتی ہیں کہ ....."

"تمہاری ممی بھی تمہاری طرح جھوٹ بولتی ہیں۔" میں جلدی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "تمہاری ممی نے کہا تھا کہ تم چھوٹے بھائی کو کھلا رہی تھیں جبکہ اس وقت تم اس جگہ موجود تھیں جہاں اس لڑکی کو قتل کیا گیا تھا کیا تم وہاں تاک جھانک نہیں کر رہی تھیں۔"

"میری ممی چوبیس گھنٹے میری نگرانی نہیں کر سکتیں اور پھر میں وہاں کوئی تاک جھانک نہیں کر رہی تھی مسٹر۔ میں تو درختوں کے نیچے کھیل رہی تھی۔"

"اور تم کہتی ہو کہ تم اس آدمی کو جانتی ہو۔"

میں نے یہ نہیں کہا کہ میں اسے جانتی ہوں۔

البتہ اگر میں چاہوں تو اس کی نشاندہی کر سکتی ہوں"

"تب پھر تم ایسا کیوں نہیں کرتیں؟"

"یہ میرا کام نہیں۔ اور پھر میں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میں کسی معاملے میں الجھنا نہیں چاہتی۔"

وہ اب بھی اپنا دامن بچانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اب یہ میرا کام تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح اس سے حقیقت اگلواؤں۔

میں اس عمر کے بچوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھا کہ ان سے سچی بات کیسے کہلوائی جا سکتی ہے اور میں جو حربہ آزمانے جا رہا تھا وہ عام طور پر ننانوے فیصد کامیاب رہتا ہے چنانچہ میں نے وہی حربہ استعمال کیا

"اوہ۔ اب سمجھا روبی! میرا دعویٰ ہے کہ تم اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتیں۔ اور تم مجھے محض بے وقوف بنا رہی ہو۔"

"کیا تم واقعی سمجھتے ہو کہ میں تمھیں بے وقوف بنا رہی ہوں؟"

"بالکل۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم اس شخص کو بالکل نہیں جانتیں۔ پچھلی تو یہ بھی معلوم کہ وہ نیلا سوٹ پہنے ہوئے تھا"

"ہاں یہ واقعی نہیں جانتی کہ وہ کہاں رہتا ہے لیکن اتنا ضرور بتا سکتی ہوں کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔"

"کہانیاں تو اچھی گھڑ لیتی ہو۔"

"یہ من گھڑت کہانی نہیں۔ سچ کہہ رہی ہوں۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ لوہا گرم ہو چکا ہے اور اب اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا زیادہ دشوار نہیں رہا۔ چنانچہ میں اسے مزید اکساتے ہوئے بولا۔

"میں تمھاری بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں۔"

"اگر میں وہاں لے جاؤں تو تم یقین کر لوگے۔؟"

"ہاں۔ اگر ایسا ہو تو شاید یقین کر لوں۔"

اس نے گہری نگاہوں سے میرے چہرے کا جائزہ لیا پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی" لیکن تمھیں وعدہ کرنا پڑے گا کہ تم کسی کو بتاؤ گے نہیں۔"

"بالکل نہیں بتاؤں گا۔ وعدہ رہا"

میں نے وعدہ کر لیا۔ اس نے یقین کرنے کے لئے ایک اسکاوٹ کی طرح ہاتھ اٹھا کر مجھ سے رازداری کا حلف لیا اور مجھے اپنے ساتھ آنے کا کہہ کر ایک طرف مڑ گئی۔

وہ چھوٹی سی لڑکی بہت تیزی سے چل رہی تھی۔ مجھے اس کی تیز رفتاری پر حیرت ہو رہی تھی۔ بہر حال ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے دو تین گلیوں سے گھوم کر ہائی اسٹریٹ پر پہنچ گئے جہاں لوگوں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ مگر وہ رفتار کم کئے بغیر لوگوں کے درمیان چکراتی ہوئی اب بھی اسی تیزی سے چل رہی تھی۔ اس رش میں مجھے اس کا ساتھ دینا مشکل ہو رہا تھا مگر میں اس طرح اسے نگاہوں میں رکھے ہوئے اس کے پیچھے چلتا رہا جیسے میری زندگی کا دارومدار اسی پر ہو۔ میرا دل بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا اور مجھے یقین سا ہو رہا تھا کہ کوئی اہم راز میرے ہاتھ آنے والا ہے

ہم تھوڑی دیر بعد اس چوراہے پر پہنچ گئے جہاں شہر سے آنے والی بڑی سڑک بھی آ رہی تھی۔ روبی چلتے چلتے اچانک ہی اس طرح رک گئی جیسے کسی کھلونے میں چابی ختم ہو گئی ہو اس طرح اچانک رکنے سے میں اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر انگوٹھے سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے تم سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ دیکھو ـــ وہ رہا وہ آدمی!"

میری نظریں اس کے اشارے کا تعاقب کرتے ہوئے چوراہے کے بیچ میں کھڑے نوجوان پولیس کانسٹبل پر جم گئیں۔ وہ نیلی وردی پہنے ہوئے تھا اس کی پشت ہماری طرف تھی مگر مجھے پہچاننے میں دیر نہ لگی اس وقت ٹریفک کو کنٹرول کرنے والا یہ وہی کانسٹبل تھا جسے اس روز میں نے سب سے پہلے قتل کی اطلاع دی تھی۔ میں تقریباً دس سکنڈ تک حیرت و تعجب سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور جب روبی کی طرف مڑا تو وہ شیطان کی خالہ غائب ہو چکی تھی۔

اسے تلاش کرنا بیکار تھا۔ وہ رش میں آسانی سے چھپ سکتی تھی۔ ممکن ہے وہ کسی اسٹور میں گھس گئی ہو یا اپنے گھر کا آدھا راستہ بھی طے کر چکی ہو۔ میں چند لمحے وہاں کھڑا رہا اور پھر دوبارہ ہائی اسٹریٹ کی طرف چل دیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ روبی مجھے بیوقوف تو نہیں بنا گئی۔ یہ کچھ نا ممکن بھی نہیں تھا وہ اب تک اپنے آپ کو جس طرح چالاک

ثابت کرتی رہی تھی اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ شریر لڑکی مجھے بیوقوف بنا گئی ہے ایک پولیس کانسٹبل کی رہنمائی کرکے ممکن ہے اب وہ مجھے اس طرح بیوقوف بنائے جانے پر دل ہی دل میں ہنستی جارہی ہو لیکن میں سوچ رہا تھا کہ کیا وہ واقعی قاتل کو جانتی ہے؟ کیا نیلا سوٹ اس کے تخیل کی پیداوار ہے یا حقیقتاً اس نے کسی نیلے سوٹ والے کو دیکھا تھا۔

وہ کانسٹبل بھی اب میری نظروں میں مشتبہ ہوگیا تھا کیونکہ وہ بھی اس روز موقع واردات پر موجود تھا یوں کہئے کہ صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا اور چند قدم کا یہ فاصلہ طے کرنا کچھ مشکل نہیں تھا وہ اس لڑکی کو قتل کرنے کے بعد چند سیکنڈ میں اتنا فاصلہ باآسانی طے کرسکتا تھا اور جب میں نے اسے قتل کی اطلاع دی تھی تو وہ تقریباً بدحواس ہوگیا تھا۔ لیکن کانسٹبل کے خلاف یہ شبہ مجھے دل سے نکالنا پڑا کیونکہ قتل کا کوئی مقصد اب تک سامنے نہیں آسکا تھا۔ مگر میں اب بھی یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے اس طرح کانسٹبل سے بھڑانے کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی —— آخر روبی مجھے وہاں کیوں لے کر آئی تھی۔ وہ کسی اور نیلے سوٹ والے تک بھی میری رہنمائی کرسکتی تھی۔ اگر میں یہ نئی اطلاع لے کر پولیس اسٹیشن جاؤں تو اسے جھوٹ کے بنڈل سے زیادہ اہمیت نہیں دی جائے گی۔ اور سارجنٹ تو میرا خوب مذاق اڑائے گا اور مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ شیطان کی خالہ روبی ایک بار پھر مجھے بیوقوف بنانے میں کامیاب ہوگئی تھی میں دل ہی دل میں روبی کو کوستا ہوا جارہا تھا کہ میری نظریں ایک ہلک بار کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کافی یا چائے کی طلب محسوس ہونے لگی اپنے حواس پر قابو پانے کے لیے میں نے دل ہی دل میں ہلک بار کی کافی کو ترجیح دی اور ہلک بار کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ یہ تنگ سا بار تھا جس کے پہلے حصے میں میزیں لگی ہوئی تھیں اور آخری حصے میں کچن وغیرہ تھا۔ کونٹر کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے اچانک ہی یہ محسوس ہوا جیسے مجھ پر سکتہ کی سی کیفیت طاری ہورہی ہو۔

ایک اسٹول پر میری طرف پشت کیئے وہ شیطان کی خالہ بیٹھی ہوئی تھی جو اب تک مجھ سے تین گنا زیادہ شیطان ثابت ہو چکی تھی۔ اس نے کہنیاں کونٹر پر ٹکا رکھی تھیں اور ایک ہاتھ میں کھانے کی کوئی چیز اٹھا رکھی تھی۔ وہ کونٹر کے دوسری طرف کھڑے ہوئے اس سیاہ فام بار ٹینڈر کی طرف دیکھ رہی تھی جو اس کی طرف رخ کیے کھڑا تھا۔

دفعتاً میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ وہ آدمی شاید ابھی سلائس وغیرہ پر مکھن لگا کر فارغ ہوا تھا کیونکہ چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کی ایک انگلی چاقو پر اس طرح حرکت کررہی تھی جیسے دھار کو آزما رہا ہو۔ اس کی نظریں کونٹر سے ذرا فاصلے پر بیٹھی ہوئی دو خوب صورت اور نوجوان لڑکیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ دفعتاً اس نے چاقو رکھ دیا اور کونٹر کے پیچھے سے نکل کر خالی کپ اٹھانے کے لئے اس میز پر پہنچ گیا کپ اٹھانے کے لئے وہ جیسے ہی دوسری طرف گھوما، اس کی پشت میرے سامنے آگئی ایپرن کے نیچے اس کا نیلا سوٹ میری نظروں کے سامنے تھا۔ کونٹر کے پیچھے پہنچنے کے بعد اس نے آئس کریم کا ایک کپ اور چاکلیٹ کا پیکٹ روبی کے سامنے رکھ دیا۔

روبی نے آئس کریم کھائی، چاکلیٹ کا پیکٹ اٹھایا اور بل کی ادائیگی کے بغیر باہر نکل گئی —— سارا معاملہ میری سمجھ میں آچکا تھا روبی کے جانے کے بعد میں بھی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں نے لوگوں کی بھیڑ میں غائب ہوتی ہوئی روبی کی ایک جھلک دیکھی لیکن میں اس کا تعاقب کرنے کی بجائے مخالف سمت چل دیا۔ میرا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف تھا —— ■

شبنم قیوم

افسانہ

یادگار

وہ بڑے انہماک سے ناول پڑھ رہا تھا کہ اس کے کانوں میں اس کے نام کی آواز آئی، وہ جلدی جلدی بیوی کے پاس آیا اور ٹھٹھک کر رہ گیا۔ لتیکا فرش پر پڑی کراہ رہی تھی اس نے امیش کو دیکھا اور فوراً اٹھ کر اس جاکر وہاں سے لیڈی ڈاکٹر سے آنے کو کہہ دیا۔

امیش سمجھ گیا لتیکا کی ڈیلیوری ہو رہی ہے اور اسے شادی کا پہلا ثمر مل رہا ہے۔

وہ جھٹ سے کار نکال کر بڑی تیزی سے روانہ ہوا، بڑی سڑک پر کار ہوا سے باتیں کرتے ہوئے جا رہی تھی۔ امیش کے خیالات میں وہ اپنے اور لتیکا کے درمیان شادی سے لے کر اب تک کی زندگی کو یاد کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا "عورت کے لیے یہ گھڑی بڑی نازک ہوتی ہے۔ بھگوان نہ کرے اگر لتیکا کو کچھ ہو گیا تو . . . " یکایک ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ کار رُک گئی۔ امیش نے بریک پر اتنا زور لگا دیا کہ سارا ماحول چیخ سا پڑا، امیش کے ہوش و حواس اُڑ گئے وہ نیچے اُترا آیا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اس نے ایک اندھے بھکاری بچے کو کار کے نیچے [illegible]

امیش ایک نظر سے اس لاش کو اور دوسری نظر سے آس پاس کو دیکھ رہا تھا! وہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس لاش کو اٹھا کر ہسپتال لیجانا چاہتا تھا لیکن لتیکا اتنی دیر تک انتظار نہیں کر سکتی تھی وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے جب وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تو . . . ! اس نے آگے بڑھ کر لاش کا جائزہ لیا وہ کچل کر مر چکا تھا۔

اس حال میں اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اب جو زندہ ہو کر مر رہا تھا اسی کو بچانے کے لیے امیش روانہ ہو گیا۔

واپسی پر لیڈی ڈاکٹر ایک نظر سے امیش کو اور دوسری نظر سے اس لمبی اور کشادہ سڑک کو دیکھ رہی تھی جس پر امیش بڑی تیزی سے کار کو دوڑا رہا تھا سڑک تا حد نظر بالکل خالی تھی لیڈی ڈاکٹر امیش کو اتنی تیزی سے کار چلانے سے منع کر رہی تھی اگر اسے ٹھکانے پر بہت جلد پہنچنے کا احساس نہ ہوتا تو گیٹ پہنچتے ہی امیش نے ایکدم بریک لگا دی کار ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ امیش گھبراہٹ [illegible]

لیڈی ڈاکٹر امیش کی اس حرکت کو بڑی حیرت سے دیکھ رہی تھی جو خالی سڑک پر نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا، قبل اس کے کہ وہ کچھ پوچھ لیتی امیش نے اندر آکر سٹیرنگ تھام لی اور کار کو اسٹارٹ کیا۔

"آپ رُک کیوں گئے تھے۔ آپ دیکھ کر رہے تھے۔؟" لیڈی ڈاکٹر نے استعجاب سے پوچھا امیش کار کی رفتار سے بڑھا کر گویا اپنے آپ سے بولا۔

"وہ لاش دیکھ رہا تھا۔"

لاش کا نام سنتے ہی لیڈی ڈاکٹر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے بڑی پھرتی سے مڑ کر دیکھا سڑک پر کوئی بھی لاش نہیں تھی امیش نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"اسے کوئی اٹھا کر لے گیا ہے۔"

"کون . . . ؟ کس کو؟" لیڈی ڈاکٹر کی آواز میں تذبذب تھا۔ امیش نے اس کا سوال گول کیا۔

"کیا آپ کو پورا بھروسہ ہے لتیکا سے جو اس وقت بچہ تولد ہو گا وہ لڑکی نہیں لڑکا ہو گا؟"

"ہاں! یہ میرا تجربہ ہے۔ لیکن وہ ناثر دہ دیکھئے ہم ٹھکانے پر پہنچ گئے۔"

لیڈی ڈاکٹر اندر کمرے میں اپنا کام کر رہی تھی اور امیش باہر بیٹھا اس لاش کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کو شاید پولیس اٹھا کر لے گئی تھی۔

"زندگی میں پہلی بار مجھ سے خون ہو گیا [illegible]

آگئی ہوگی۔ کیا اس کا بدلہ مجھے اپنے خون سے دینا پڑے گا؟ کیا آج سے میں ایک ظالم خونی کہلواؤں گا۔ کیا....."

یکایک ایک آہٹ سے وہ چونک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا لیڈی ڈاکٹر کھڑی تھی۔

"بھگوان نے آپ کو بیٹا دیا، لیکن وہ..... وہ اندھا ہے"

یکایک ایک زلزلہ سا ہوا، امیش جھنجھلا سا رہ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دیوار کے ساتھ سر کو ٹکرایا اور..... وہ چیخنا چلانا چاہتا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا "میرا بیٹا اندھا نہیں تھا وہ اندھا ہو گیا ہے وہ ابھی ابھی اندھا ہو گیا۔ بھگوان نے مجھے اندھے بھکاری بچے کے خون کی یہ عمر بھر کی سزا دی۔ میرا یہ بیٹا میرے گھر میں اس خون کی ایک یادگار رہے۔" مگر لیڈی ڈاکٹر کی موجودگی میں وہ کہہ نہ سکا، اس کا یہ راز ایک لاوا بن گیا جو پھٹنے کو آ رہا تھا لیکن پھٹ نہیں سکتا تھا۔ امیش نے ارادہ کر لیا وہ عمر بھر کی سزا کے بجائے صرف ایک بار کی سزا قبول کرے گا اور اس کے لیے وہ پولیس کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرے گا مگر نہ وہ پولیس کے سامنے پیش ہو سکا اور نہ ہی اس سزا سے چھٹکارا پا سکا۔ اندھے بیٹے کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے اندر کا روگ بھی بڑھنے لگا۔ پریشانی اور الجھن میں کئی سال بیت گئے۔ اور ان گزرے ہوئے سالوں میں امیش کہیں بھی جاتا تو ڈی گیٹ پہنچ کر آپ ہی آپ اس کی کار ایک جھٹکے کے ساتھ اس انداز سے رک جاتی تھی گویا ابھی وقت اندھا بھکاری بچہ اس کار کے نیچے آیا ہے۔ امیش کار سے نیچے اتر کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتا اور اپنی اس حماقت کا احساس ہوتے ہی وہ یہاں سے چلا جاتا تھا۔ لیکن واپسی پر آپ ہی آپ اس کی کار کی رفتار دھیمی پڑ جاتی تھی اور وہ نظریں دوڑا کر اس طرح دیکھنے لگتا تھا گویا وہ لاش ابھی ابھی کوئی اٹھا کر لے گیا ہے۔

امیش نے پچھلے آٹھ سال کے عرصے میں سینکڑوں اور ہزاروں بار اس بات کا مصمم ارادہ کیا کہ اب سے میں کبھی بھی ڈی گیٹ پہنچ کر کار کو نہیں روکوں گا مگر اس ارادے کے باوجود بھی کار یہاں پر رک جاتی تھی اور وہ اپنے آپ کو کوس کر چلا جاتا تھا، کوٹھی پر آ کر وہ اس ذہنی الجھن سے نجات پانے کے لیے اپنے ارادوں پر قابو پانا اور دوسروں کے کہنے پر عمل کرنے کا عہد کرتا تھا۔ لیکن اندھے بھکاری کی یادگار راجیش بیٹے پر نظر پڑتے ہی اس کا خونی جسم کانپنے لگتا تھا اور وہ گھنٹوں اس کی یاد میں پچھتانے لگتا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ ہر وقت مغموم اور پریشان رہنے کی وجہ سے اس کی دماغی قوت بھی سلب ہونے لگی اسے وقت بے وقت دورے پڑنے لگے۔ اس کی قابلِ رحم حالت کو دیکھ کر لتیکا سخت پریشان تھی وہ اس کے لیے ہمدردی تھی مگر اسے ہر وقت مغموم رہنے سے منع کرتی تھی۔

بارہ سال کے عرصے میں اس نے بیوی کے علاوہ یار دوستوں کے سامنے لاکھوں بار اس بات کا وعدہ کیا کہ میں ڈی گیٹ پہنچ کر کار کو نہیں روکا کروں گا۔ مگر ڈی گیٹ پہنچ کر وہ رک جاتا تھا۔ اور اس واقعہ کی یاد میں پچھتانے لگتا تھا۔

امیش نے اس ذہنی الجھن اور اندرونی روگ سے چھٹکارا پانے کے لیے پندرہ سال تک کتنے ڈاکٹری مشورے لیے، کتنے حکیموں کے نسخے آزمائے، اپنوں اور غیروں کی ہدایات پر اس نے مدتوں اپنی کوٹھی سے دور رہ کر اس یاد کو بھولنے کے لیے صحت افزا مقامات کی سیر کی، لیکن جب وہاں سے واپس آیا۔ پھر اسی الجھن کا شکار ہو گیا۔ جب اسے اس الجھن سے نجات دلانے میں تمام حربے ناکام ہو گئے تو ڈاکٹروں کے ایک بورڈ نے اتفاق رائے سے یہ تسلیم کر لیا کہ امیش مالیخولیا کا شکار ہو چکا ہے۔ اور جب تک ڈی گیٹ کے پاس کوئی اندھا لڑکا اس کی کار کے نیچے نہیں آئے گا اور امیش اسے اپنی کار میں بٹھا کر ہسپتال لیجا کر اس کی مرہم پٹی نہیں کرائے گا تب تک اسے اس روگ سے نجات دلانا نہایت ہی مشکل ہے۔ مگر یہ کام بذاتِ خود ایک مشکل کام ہے جس کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہو سکتا چاہے وہ اندھا بھکاری ہی

کیوں نہ ہو۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب امیش کے روگ میں افاقہ ہونے کے بجائے اضافہ ہی ہوتا گیا اور اس کی صحت روز بروز بگڑنے لگی تو لتیکا سے اس کی حالت دیکھی نہ گئی، امیش کے لیے اس نے کتنی بار خودکشی کرنے کا ارادہ کیا مگر ہر بار اسے ناکامی ہوتی۔ امیش کو مالیخولیا سے نجات دلانے کے لیے اس نے قربانی کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا تو اس کی پیشکش ٹھکرا دی گئی تھی اس لیے کہ اس کام کے لیے ایک جوان انسان لڑکے کی ضرورت تھی جو اس کا بیٹا راجیش بھی ہو سکتا تھا لیکن راجیش کا اپنے باپ کی کار کے ساتھ ٹکرانا اور زخمی ہونا لتیکا کے لیے ناقابل برداشت تھا اگرچہ اس کے بغیر اس کا جیون کسی کام کا نہ تھا ——

لتیکا ماںتا پر جبر کر کے راجیش سے کہنا چاہتی تھی تم اپنے باپ کے لیے اتنی سی قربانی دے دو لیکن وہ کہہ نہ سکی، لیکن امیش کی خراب حالت دیکھ کر آخر ایک روز وہ مجبور ہو ہی گئی اور اس نے......

اپنے نام کی آواز سن کر امیش چونک گیا۔ وہ ناول رکھ کر ایک دم کھڑا ہوا اور دوسرے لمحے اندر چلا گیا، لتیکا پر نظر پڑتے ہی وہ دھک سے رہ گیا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی تھی اور وہ .....، وہ امیش کی طرف بڑے اضطراب سے کہہ رہی تھی۔

" امیش! مجھے بچاؤ، مجھے کسی طرح بچاؤ ورنہ میں مر جاؤں گی۔ تم جا کر فوراً کسی ڈاکٹر کو لے آؤ۔ میں نے زہر کھا لیا ہے مرنے کے لیے ——، مگر اب میں مرنا نہیں چاہتی، میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔

" لتیکا! یہ تم نے کیا کیا؟"

" میں اور کیا کرتی، امیش ——! مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی، میں تو متواتر سولہ سال سے یہ زہر کھاتی آ رہی ہوں، آج اس زہر نے اپنا اثر دکھایا۔ مگر مجھے کسی طرح بچاؤ تاکہ میں اولاد کو وہ الفاظ واپس لینے کے لیے مجبور کر سکوں جنھوں نے مجھے زبردست ٹھیس پہنچائی، میں نے تمہارے لیے قربانی..... مگر میں یہ کس کو کہہ رہی ہوں۔ وہ تو چلا گیا ہے۔

کافی مسافت طے کر کے امیش اپنے آپ کو اس بات کے لیے کوسنے لگا کہ میں لتیکا کے لیے ڈاکٹر لے آنے کے بجائے اسے کار میں بٹھا کر کیوں نہیں لے آیا تھا تاکہ اسٹیٹ ہسپتال لے جا کر اس کا اسٹامک واش کیا جاتا۔ لتیکا کی حالت اور اس کی فریاد وہاں اسے یہ سوچنے کا موقع ہی نہ دے سکی تھی، لیکن اب وہ بڑی تیزی سے کار دوڑا رہا تھا اور اس بات کا وعدہ کر رہا تھا کہ میں ڈیگیٹ پہنچ کر اس وقت کار کو نہیں روکوں گا اور نہ ہی کار سے اتر کر اس لاش کو ڈھونڈوں گا جس نے سولہ سال سے مجھے پریشان کر رکھا ہے جس نے میری بیوی کو آج اس حال پر پہنچا دیا کہ وہ زہر کھانے کے لیے مجبور ہو گئی۔ میں کار ہرگز نہیں روکوں گا۔ میں..... یکایک ایک جھٹکے کے ساتھ کار رک گئی۔ وہ ڈیگیٹ پہنچ چکا تھا۔

امیش مجسم حیرت بن کر دیکھنے لگا اسے اس حقیقت پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن وہ سولہ سال کی کھوئی ہوئی اس لاش کو دیکھ رہا تھا جو کار کے سامنے پڑی ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔

ایسا نہیں ہو سکتا، یہ سب میری قوتِ متخیلہ ہے، میں پاگل ہو گیا ہوں مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیئے کیونکہ لتیکا۔" بیوی کی یاد آتے ہی وہ دیوانہ وار کار کو اسٹارٹ کرنے لگا۔ پہلے اسے ریورس کیا پھر اسٹیرنگ گھما کر چلنے لگا کہ ایک بار اور ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ امیش حیران اور ششدر ہوا لاش نہ صرف حرکت کر رہی تھی بلکہ اس سے کہہ رہی تھی ——" مجھے زخمی کرنے سے پہلے ہی آپ نے گاڑی کا ریورس کیوں کی، اگر آپ کو اپنی بیوی کو بچانا ہے تو پہلے مجھے زخمی کر کے ہسپتال لے جاؤ ورنہ کوئی بھی ماں اپنی اولاد پر بھروسہ نہیں کر سکے گی۔"

بہت دور جا کر امیش نے کار کی رفتار دھیمی کر دی اور وہ سوچنے لگا۔" یہ کون نوجوان تھا اور یہ میری کار کے نیچے آ کر زخمی ہونا کیوں چاہتا تھا، اسے کیسے پتہ چلا کہ... کہیں یہ..... !" یکایک اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ وہ کار کو روک کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگا۔

"راجیش! یہ تم نے کیا کیا ... ؟ یہ تم کو کیا ہوگیا؟ تم نے میری خاطر یہ کیا کیا؟ تم سڑک پر پڑے تڑپ رہے ہوں گے اور تمہاری ماں گھر میں مر رہی ہوگی۔ اگر میں اُس کو بچا لوں گا تو تم مر جاؤ گے۔ اگر میں تم کو بچاؤں گا تو وہ مر جائے گی، میں کیا کروں اور کدھر جاؤں ... ؟ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا وہ بہت دور نکل آیا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔

"اگر میں واپس جا کر راجیش کو اُٹھا لاؤں گا اور ہسپتال لے جا کر اس کی مرہم پٹی کراؤں گا تو وہ بچ جائے گا اس کی زندگی لوٹ آئے گی، مگر لتیکا ...... وہ اتنی دیر تک انتظار نہیں کر سکتی، لتیکا مر جائے گی تو میں ... اس نے ایکدم کار کو اسٹارٹ کیا اور جتنی جلدی وہ کار اسٹارٹ کر کے چلا یا اتنی ہی جلدی تھوڑے فاصلے پر رُک بھی گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو زور سے پکڑ لیا۔

وہ بیٹے کو بچا کر لتیکا کو مار رہا تھا اور بیوی کو بچا کر راجیش کو مار رہا تھا۔

یکایک اس کے تن بدن میں ایک حرکت سی پیدا ہوگئی۔ اس نے جلدی جلدی اپنے آپ کا جائزہ لیا، اتنی دیر تک یہاں ٹھہر کر جو قیمتی وقت اس نے گنوا دیا تھا اس کا احساس ہوتے ہی وہ جانا چاہتا تھا مگر کہاں ؟ ؟

ایکبار اور اس کے ذہن میں طلاطم بپا ہوگیا۔

"کیا وہ راجیش کے پاس جا کر اسے اُٹھا لائے گا ___ ؟ کیا وہ پہلے لتیکا کے لیے ڈاکٹر لے آنے جائے گا" آخر وہ کیا کرے گا؟"

جب وہ دوبارہ کار اسٹارٹ کر کے چلا یا تو اس کی حیرت کی انتہا ہی نہ رہی اس لیے کہ وہ اب ڈ گیٹ پہنچ رہا تھا۔ راجیش اور لتیکا جو کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے اسے یہاں پر کار روکنے پر ٹوک رہے تھے ___ امیش نے مڑ کر دیکھا تو شرمندہ ہو کر بولا۔

"آج آخری بار یہاں پر رُکا ہوں، آئندہ اب ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ تمہارے کہنے پر ہی تو ہم اپنی کوٹھی کے ساتھ اس سڑک کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر جا رہے ہیں۔

امیش نے اپنے آپ کا جائزہ لیا تو وہ کسی کو بھی خیرباد کہہ کر نہیں جا رہا تھا۔ بلکہ اپنی کوٹھی کے ریڈنگ روم میں بیٹھا ریڈیو پر شبنم قیوم کا لکھا ہوا ڈرامہ "میا دتکار" سن رہا تھا۔ جو اسی کی زندگی پر لکھا گیا تھا۔ ▬ ▬

مضامین صاف اور خوشخط، صفحہ کی ایک ہی جانب لکھ کر روانہ کیجئے۔

جواب طلب امور کیلئے جوابی لفافہ یا ڈاک ٹکٹ کا آنا ضروری ہے (ادارہ)

ساحر لدھیانوی

(فلمی ڈائری)

ابھی ہماری فلمی دنیا اپنی قسمت پہ رو رہی تھی کہ اس کی سحر انگیز آواز کہیں کھو گئی اور ابھی آنسو خشک بھی نہیں ہوئے تھے کہ آواز کو نغموں کا سحر عطا کرنے والا جادوگر کسی لافانی نغمے کی تلاش میں اس فانی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ۲۵ اکتوبر کی شب ساحر لدھیانوی جو تیس برس تک فلمی موسیقی کو اپنے گیتوں سے روشن کرتے رہے اپنے چراغ حیات کو موت کی آندھی سے نہیں بچا سکے اس رات ۹ بجے وہ اپنے ورسوا کے پرانے مکان میں ایک ڈاکٹر دوست کے ساتھ پتے کھیل رہے تھے کہ ان پر دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ دل کے اس حملے سے پہلے وہ اچھے خاصے اور صحت مند تھے۔ صرف دو دن پہلے انہوں نے ایک گانے کے تعلق سے بی آر چوپڑہ سے بات چیت کی تھی۔ ساحر ان فلمی شاعروں میں سے نہیں ہیں جو فلموں کے ساتھ موسیقی کے سہارے شہرت و مقبولیت حاصل کرتے ہیں اور جب وقت کے ساتھ فلموں کا سحر ختم ہوتا ہے تو ان کی مقبولیت بھی نقش بر آب ثابت ہوتی ہے فلموں میں آنے سے پہلے ساحر نے اردو ادب میں فکر و خیال کے وہ نقوش چھوڑے ہیں جو اردو شاعری کے سرمایہ کا ناقابل فراموش حصہ ہیں۔

ساحر ۱۹۲۱ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے اور یہیں خالصہ کالج میں تعلیم حاصل کی لیکن وہ ڈگری نہیں لے سکے انہیں کالج سے نکال دیا گیا۔ کالج کی فضاؤں کو یاد کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

ہم بھی انہی فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گو یاں نہیں ہیں یاں سے نکالے ہوئے تو ہیں

کالج سے نکلنے کے بعد ساحر لدھیانوی ان نوجوان دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کی صف میں شامل ہو گئے جو اپنے قلم کے ذریعے ان سرمایہ داروں کے خلاف جنگ کر رہے تھے جنھوں نے غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کو اپنے استحصال کا شکار بنایا تھا۔ اشتراکیت کو انسانیت کے دکھوں کا مداوا سمجھنے والے ان قلمکاروں نے ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالی تھی۔ ساحر کا شمار ترقی پسند تحریک کے قابل فخر قلم کاروں میں ہوتا ہے انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو فن کی آنچ میں تپا کر ایک گرانقدر [illegible] سرمایہ کی صورت میں [illegible] والوں کو لوٹایا۔ حق گوئی و بے باکی میں سرشار ان کے قلم نے سماج کے ناسور پر نشتر زنی کی۔ مفلسی کے [illegible] میں بھٹکتی ہوئی زندگی کے جسم پر درد و غم کے چیتھڑے دیکھے تو انہوں نے تڑپ کر کہا۔

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

لیکن جب اس درد کا کوئی [illegible] نظر نہ آیا تو انہیں کہنا پڑا۔

عمر بھر رینگتے رہنے کی سزا ہے جینا
ایک دو دن کی اذیت ہو تو کوئی سہہ لے

جہاں وہ معصوم انسانوں [illegible] کو دیکھ کر چلا اٹھتے ہیں

اے رہبرِ ملک و قوم بتا یہ کس کا لہو [illegible]

وہیں ستیا اور مریم کی عزت کو [illegible] دیکھ کر انہوں نے سماج کے ٹھیکیداروں کو آواز بھی دی تھی۔

ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

ثنا خوانِ تہذیبِ مشرق [illegible]

ساحر نے اپنی شہرہ آفاق [illegible] تاج محل لکھی تو تاج کو محبت کی [illegible] کرنے والے چیں بہ جبیں ہو گئے

تاج تیرے لئے اک مظہرِ الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیِ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

اگر آپ قدامت پسند [illegible] [illegible] نہ جانے دیں تو ساحر [illegible]

...ے کہا جاسکتا ہے آپ کی زبان
...ہو سکتی ہے یا خاموش ہو سکتی
...جذبہ کی شدت، اظہار کی بے باکی
...ال کی جرأت کی داد دینے کے لیے
...کا دل تڑپ اٹھے گا۔

ساحر جب ۲۱ سال کے تھے تو ان
...مجموعہ "تلخیاں" شائع ہو گیا تھا اس
"تلخیاں" کے جتنے ایڈیشن شائع
...ہیں اردو کے دو تین کلاسک شعراء
...ذکر کسی دوسرے شاعر کو یہ اعزاز
...نہ ہو سکا۔ "تلخیاں" کے بعد پیر چھائیاں
ساحر کے فلمی گیتوں کا مجموعہ "گاتا
...ائے بنجارہ" بھی منظر عام پر آچکے ہیں

ساحر نے ۱۹۴۴ء میں پہلی مرتبہ
...دنیا میں قدم رکھا۔ لیکن اس بار انہیں
...کی فضا راس نہ آئی اور وہ دلی چلے
...وہاں ترقی پسند تحریک کے ترجمان
...ے "شاہراہ" کے مدیر بن گئے۔ اسی
...نے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک فلم ساز
...اس گئے کہ انہیں گانے لکھنے کا موقع
...کے لیکن اس فلم ساز نے جواب دیا
...انے تو دوسرا شاعر لکھ رہا ہے۔ اب
...وہ کچھ کام چاہتے ہیں تو اس فلم کے
...شر کے مسودے صاف خط میں لکھ
...لتے ہیں رائٹر بہت بدخط ہے ساحر
...رائٹر کا نام دریافت کیا تو فلم ساز
...جواب دیا کرشن چندر۔ ساحر
...ب دوسری مرتبہ فلمی دنیا میں آئے

تو آپ کہہ سکتے ہیں "وہ آئے۔ انہوں
نے دیکھا اور انہوں نے فتح کر لیا۔"

ساحر کی پہلی فلم "نوجوان" تھی
جس کی موسیقی ایس ڈی برمن دے
رہے تھے لیکن یہ فلم کچھ خاطر خواہ کامیاب
نہیں ہو سکی۔ اس کے بعد بازی۔
لگا لے داؤ لگا لے۔ ٹیکسی ڈرائیور
جائیں تو جائیں کہاں۔ منیم جی۔ دکھی
من مورے "منیم جی" جیون کے سفر
میں راہی"۔ اور ایسے ہی بے شمار
گانوں نے ساحر کو تماشائیوں اور
فلم سازوں کا مقبول گیت کار بنا دیا۔

"پیاسا" میں گرو دت نے سلولائیڈ
میں شاعری کی تھی اور اس شاعری کی
روح ساحر کے نغمے تھے۔ اس کے بعد
ساحر نے او پی نیر کے ساتھ کئی سحر انگیز
گیت لکھے۔ سونے کی چڑیا۔ پیار پر بس
تو نہیں ہے لیکن۔ "نیا دور" ساتھی
ہاتھ بڑھانا ساتھی رے۔ تم سا نہیں
دیکھا۔ "یوں تو ہم نے لاکھ حسیں دیکھے
ہیں۔ اس کے بعد این دتہ کی موسیقی کو
انہوں نے زندگی دی۔ دھول کا پھول۔
تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا۔ لاسٹ
ہاؤس "تنگ آچکے ہیں کشمکش زندگی
سے ہم"۔ "میرین ڈرائیو"۔ اب وہ کرم
کریں کہ ستم "ساحر نے روی کے ساتھ
بھی کام کیا اور کئی نغموں کو لازوال بنا
دیا۔ ہمراز۔ نہ سر چھپا کے جیو نے

گمراہ۔ "چلو ایک بار پھر سے اجنبی بن جائیں
ہم دونوں"۔ آدمی اور انسان "جاگے گا
انسان زمانہ دیکھے گا"۔ وقت۔ اے میری
زہرہ جبیں"۔ ساحر نے روشن کے ساتھ
فلم "چتر لیکھا" میں ہندی گیت لکھ کر
ہندی شاعروں اور ادیبوں کو بتایا کہ ہندی
کو مقبول کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ روشن کے
ساتھ فلم "تاج محل" اور "برسات کی
رات" کے گانے ساحر کے جادو نگار قلم
کی یادگار رہیں گے۔ فلم "کبھی کبھی" میں
ساحر کے گیت کبھی بھی نہیں بھلائے
جا سکتے۔ ساحر نے تیس سال کے عرصے
میں سو سے زیادہ فلموں کے لئے گانے
لکھے اور ان کے بے شمار گانے امر ہو چکے
ہیں۔ وہ ان دنوں بی آر چوپڑا کی فلم
"تکشی" کے گانے لکھ رہے تھے۔

ساحر نے فلمی دنیا میں گیت کار کے
مقام کو بلند کیا۔ انہوں نے کبھی سبک سر
ہو کر اپنے وقار اور مقام کی قربانی نہیں
دی۔ ایک زمانہ تھا جب وہ فلم ساز
اور موسیقار کے سامنے اپنی شرائط
رکھتے تھے اور ان شرطوں کو قبول کیا
جاتا تھا۔ وہ اپنی مرضی اور اصول کے
مطابق کام کرتے تھے اور اس سلسلے میں
بڑی سی بڑی شخصیت کو خاطر میں
نہیں لاتے تھے۔ ان کے کلام کا کئی
زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ انہیں کئی انعام
و اعزاز عطا کیے گئے۔ ۱۹۷۰ء میں

انہیں پدم شری کا خطاب بھی ملا۔ لیکن
حقیقی اعزاز اور انعام تو یہ ہے کہ وہ اردو
کے پرستاروں کے دلوں میں ایک عظیم شاعر
اور ایک بے مثال گیت کار کی حیثیت سے
ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ سانتا کروز کے قبرستان
میں ان کے جسدِ خاکی کو سپرد لحد کیا گیا۔ اس
موقع پر بمبئی کے شاعروں، ادیبوں اور
اردو کے پرستاروں کے علاوہ فلمی دنیا
کے گیت کاروں، موسیقاروں اور فلم
سازوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی
لیکن فلمی ستاروں میں دلیپ کمار، جانی
واکر، چندر شیکھر اور آغا کے سوائے
اور کوئی نہیں تھا ہمارے فلمی ستاروں
کی بے حسی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

★

جی پی سپی کی "شان" جو اس ماہ
ریلیز ہو رہی ہے چھ کروڑ کی لاگت سے
مکمل ہوئی ہے اور اس طرح یہ اب
تک بننے والی ہندی فلموں میں سب سے
زیادہ لاگت کی فلم ہے۔ بعض تقسیم کے
حلقوں کے لئے اس کا معاوضہ ایک
کروڑ تک پہنچ گیا ہے جو کسی بھی دو ملٹی
اسٹار فلموں کے معاوضے سے زیادہ
ہے شوٹنگ میں جتنا فلم کا اسٹاک
صرف ہوا ہے اس سے بہ آسانی چار
بی کلاس فلمیں بن سکتی ہیں۔ ۲۳ ریل
کی اس فلم میں کئی سین ایسے ہیں کہ
تماشائی دم بخود ہو جائیں گے۔ فلم
کے ہدایت کار رمیش سپی کا کہنا ہے کہ
ایک سین جس میں امیتابھ بچن ایک
مگرمچھ سے لڑتا ہے انتہائی حیرت انگیز
اور بے حد خوبصورت انداز میں
فلمایا گیا ہے اور اس کی فلم ہندی ہالی
ووڈ کی بڑی فلموں کی طرح نظر فریب
اور سنسنی خیز ہے۔ ایک دوسرے
انتہائی سنسنی خیز سین میں ہیلی کاپٹر
کے ذریعے سنیل دت کا پیچھا کیا جاتا
ہے سنیل دت نے اس فلم میں ایک
مہمان اداکار کی حیثیت سے کام کیا
ہے لیکن اس کا کام ۶۰ شفٹوں میں
مکمل ہوا ہے۔ اتنی شفٹیں عام طور پر
ایک مکمل رول کے لئے ضروری ہوتی
ہیں۔ فلم کے ایک سیٹ کو جس پر ۱۲ لاکھ
روپے کی لاگت آئی تھی پروین بابی کی
بیماری کی وجہ سے چھ مہینے تک اسٹوڈیو
میں جوں کا توں رکھ کر کرایہ ادا کرنا پڑا۔
کار ریس کے ایسے سین پیش کئے گئے ہیں
جو آج سے پہلے ہندی فلموں میں نہیں
پیش کئے گئے تھے ایک امپورٹیڈ کار
PORSCHE SPORTS استعمال
کی گئی ہے جو اپنی قسم کی سالم ہندستان
میں صرف ایک کار ہے۔ اس فلم کے ویلن
کے لئے سنجیو کمار کا انتہائی اہم کردار ہے
پہلے سنجیو کمار سے بات چیت کی گئی تھی
رمیش سپی نے سنجیو کمار سے کہا تھا کہ فلم
کی شوٹنگ کے دوران اس کے نام
کی پبلسٹی نہیں ہوگی اور وہ فلم یا فلم میں
اپنے رول کے تعلق سے کسی بھی صحافی سے
گفتگو نہیں کریں گے۔ لیکن یہ شرط
ہری بھائی کو منظور نہیں تھی اور انہوں
نے کام سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد
سلیم جاوید کی سفارش پر جی پی سپی نے
کل بھوشن کھربندا کو اس رول کے لئے
منتخب کیا۔ رمیش سپی کا کہنا ہے کہ
"شان" کی ریلیز کے بعد کل بھوشن
ہندی فلموں کا سب سے بڑا ویلن بن
جائے گا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امجد خان کی
تاریخ اس بار بھی دہرائی جائے گی۔
اسی لئے کل بھوشن کے کردار کو انتہائی
راز میں رکھ کر اور اُسے اخبار نویسوں
سے دُور رکھ کر رمیش سپی نے سسپنس
کی فضا تیار کرنے کی کوشش کی ہے
یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ امجد خان
کو جہاں اپنی پہلی آمد کے ساتھ ہی فلمی
دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا تھا اور
لاکھوں تماشائیوں کے دل جیت لیے
تھے وہیں کل بھوشن کی یہ پہلی فلم نہیں
کل بھوشن کو سب سے پہلے شیام
بینیگل نے اپنی فلم "نشانت" میں
پیش کیا تھا اس کے بعد اُس نے
"منتھن"، "بھومیکا" اور "جنون" میں
چھوٹے چھوٹے رول کئے۔ اب اگر
"شان" میں اُسے کوئی اہم رول دیا گیا
ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ تماشائی اُس سے

لتنے زیادہ متاثر نہیں ہوں گے جتنا رمیش
سپی سمجھ رہے ہیں۔ کل بھوشن فلموں میں
آنے سے پہلے دہلی اور کلکتہ میں اسٹیج
ڈراموں میں کام کیا کرتا تھا۔ آج بہت
سے فلم ساز اُسے اپنی فلموں میں پیش کرنے
کے لیے بے چین ہیں۔ "شان" کے
اداکاروں میں امیتابھ بچن، پروین
بابی، سنیل دت، شتروگھن سنہا
ششی کپور، راکھی، بندیا گوسوامی،
مظہر خاں، جانی واکر، پدمنی کپیلا، کیٹی مرزا
اور کل بھوشن شامل ہیں۔ موسیقی آر ڈی
برمن کی ہے اور کہانی، اسکرین پلے اور
مکالموں کے ذمہ دار سلیم جاوید ہیں۔
جی پی سپی اور رمیش سپی کے جمالیاتی
دعوے باکس آفس پر آکر کتنے بارآور
ثابت ہوتے ہیں یہ تو آنے والا وقت
ہی بتائے گا۔

★

فلموں میں آنے سے پہلے دلی کے
اسٹیج ڈراموں میں کام کرنے والا خوبصورت
نوجوان راج ببر جسے سب سے پہلے
بی آر چوپڑہ نے اپنی فلم "انصاف کا ترازو"
میں پیش کیا اور جو فلم کی ریلیز سے پہلے
ہی فلمی دنیا میں اتنا مشہور ہوا کہ کئی
فلم سازوں نے اُسے سائن کر لیا۔ چند
دن پہلے اپنی کسی فلم کی شوٹنگ سے گھر
واپس ہوتے ہوئے ایک حادثہ کا شکار
ہو گیا۔ فلم سازوں نے جب یہ بات سنی
تو وہ بے حد پریشان ہو گئے۔ لیکن
انہیں بعد میں پتہ چلا کہ راج ببر کو
معمولی زخم آئے ہیں اور وہ چند دنوں
کے آرام کے بعد فلموں میں کام کر سکے گا
آرام کے دن ختم ہو چکے ہیں اور راج ببر
اب اپنی فلموں کی شوٹنگ میں باقاعدہ
حصہ لے رہا ہے۔ اس کی دو فلمیں "انصاف
کا ترازو" اور "آپ تو ایسے نہ تھے"
اسی مہینے ریلیز ہونے والی ہیں۔ ویسے
راج ببر کا کہنا ہے کہ اس کے پاس اس
وقت ۲۵ فلمیں ہیں۔ ان دنوں فلمی
دنیا میں راج ببر اور رینا رائے کے
معاشقہ کی خبر گرم ہے۔ لوگوں کا خیال
ہے کہ شتروگھن کی شادی کے بعد اس سے
الگ ہو کر رینا رائے ذہنی طور پر اتنی
مایوس اور پریشان ہے کہ اس نے
راج ببر جیسے ایک شادی شدہ اور
نئے اداکار سے پینگیں بڑھانی شروع
کر دیں۔ جس زمانے میں راج ببر کے
پاس کار نہیں تھی رینا رائے اپنی کار
میں اُسے گھر تک چھوڑتی تھی۔ اپنی
فلموں کی شوٹنگ کے دوران بھی وہ
ایک دوسرے کے سیٹ پر آکر بڑے
بے تکلف انداز میں ملتے۔ بعض لوگوں
کا خیال ہے کہ راج ببر رینا رائے کے
سہارے اپنا مستقبل بنانا چاہتا ہے
رینا رائے سے جب اس معاشقہ کے
بارے میں پوچھا گیا تو اس نے بڑی خود
اعتمادی کے ساتھ جواب دیا کہ راج ببر
اس کا دوست ہے اور اس سے زیادہ
وہ اس کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی۔
ویسے بھی رینا رائے شتروگھن کی شادی
کے بعد بھی اس سے بہت قریب ہے اور
ظاہر ہے کہ وہ اس قربت کو کسی اسکینڈل
کی وجہ دوری میں بدلنا کیوں چاہے گی۔
راج ببر سے جب اس بارے میں سوال
کیا گیا تو اس نے کہا کہ میں جس مقام پر
ہوں وہاں مجھے کسی سہارے کی ضرورت
نہیں۔ پھر بھی سہارا لینا ہی چاہوں گا تو
زینت کی طرف بڑھ سکتا ہوں جو میرے
ساتھ کام کر رہی ہے۔

★

"ایک بار پھر" کی ہیروئن دیپتی نیول
اپنے ہیرو پردیپ ورما سے جسے وہ اپنی
حقیقی زندگی میں بھی ہیرو تسلیم کر چکی تھی
اب آہستہ آہستہ دور ہو رہی ہے۔
فلم کی شوٹنگ کے دوران دونوں محبت
میں اندھے ہو رہے تھے لیکن فلم کی ریلیز
کے بعد ایسا لگتا ہے کہ دیپتی نیول دل
سے زیادہ عقل پر بھروسہ کرنے لگی ہے۔
پردیپ ورما نے جب شادی کی تجویز رکھی تو
دیپتی نے کہا کہ شادی کے لیے جلدی کیا ہے
اس وقت جب کہ وہ اپنا اپنا مستقبل
سنوارنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں
شادی ان کی راہ میں دیوار بن سکتی ہے
پردیپ نے دل پر جبر کر کے دیپتی کی بات

مانتی لیکن اب انہیں محسوس ہو رہا ہے
کہ شادی کا خواب کبھی پورا نہیں ہو گا۔ دیتی
اب اس سے بہت دور ہو گئی ہے۔ وہ
آج کل گلزار کے دل کو باغ و بہار کر رہی
ہے شاید اس طرح وہ اپنے مستقبل کی
بہار کو پا لے۔

★

پچھلے دنوں دھرمیندر پیٹ کے
درد سے بیمار پڑا تو اپنا قانونی بیوی پرکاش
کے ساتھ رہا۔ یہاں تیمار داری کی خاطر بھی
ہیما مالینی کو داخلہ نہیں مل سکا۔ اور وہ
بے چاری دھرم کے صحت مند ہونے کی
دعا کرتی رہی۔ دھرمیندر یوں بھی آج
کل پارٹیوں وغیرہ میں ہیما مالینی کے ساتھ
نظر نہیں آ رہا ہے شاید پرکاش کے زخم
پر مرہم رکھنے کے لیے وہ زیادہ توجہ
اپنے گھر پر دے رہا ہے اور زیادہ وقت
پرکاش کے ساتھ گزار رہا ہے حال ہی
میں اس نے پرکاش کے لیے کافی قیمتی زیور
خریدے۔ لیکن ہیما اپنے پتی کے اس برتاؤ
سے دل برداشتہ نہیں ہے۔ وہ دھرم کے
نازک موقف کو محسوس کرتی ہے۔

★

وہ تمام فلمیں جس میں راج کپور
نے کیریکٹر رول ادا کیا ہے باکس آفس پر
ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ دھرم کرم، کل
آج اور کل، دو جاسوس، خان دوست
نواب سنجے خان کی "عبداللہ"۔

"کرانتی" مکمل ہو چکی ہے اور اب ایک
ادھ ہفتے میں منوج کمار فلم کی پرنٹنگ
کے لیے جاپان روانہ ہو جائیں گے۔ یہ
ہندوستان میں بننے والی پہلی فلم ہے
جس کی پرنٹنگ جاپان میں ہوگی۔

★

"بلٹز" ہندوستان کا سب سے زیادہ
شائع ہونے والا ہفتہ وار ہے۔ انگریزی
کے علاوہ اس کے ہندی اور اردو ایڈیشن
بھی شائع ہوتے ہیں۔ ہندی کے ایڈیٹر
اس کے نونہال جاٹ انٹرنیشنل کی فلم
"کنچن" کی کہانی لکھ رہے ہیں جس کے گانے
اردو بلٹز کے ایڈیٹر حسن کمال لکھیں گے۔

★

فلموں کے نام پبلسٹی کے لیے کس
طرح استعمال کیے جاتے ہیں اس کا اندازہ
اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایئر انڈیا
نے فلم "قربانی" کے مشہور گانے "آپ
جیسا کوئی میری زندگی میں آئے تو بات
بن جائے" کو سامنے رکھ کر کیپشن تیار
کیا ہے۔ "آپ جیسا کوئی میرے ہوائی جہاز
میں آئے تو بات بن جائے"۔ "پیارا
دشمن" کا گانا "ہری اوم ہری" بہت
مقبول ہو رہا ہے۔ امول بٹر والے
اسے پبلسٹی کے لیے اس طرح استعمال
کر رہے ہیں (HURRY HOME
HURRY FORAMUL BUTTER)
یعنی امول بٹر کے لیے جلد گھر آ جیے۔

چارٹرڈ بینک والوں نے اپنی پبلسٹی کچھ اس
طرح کی ہے "چارٹرڈ بینک کے ساتھ
"دوستانہ" کیجئے۔ یہ ہے ہماری فلموں
کی مقبولیت۔ پبلسٹی کمپنیوں کی
موقع شناسی کی داد دیجئے۔

★

کہا جاتا ہے کہ سنجے نے "عبداللہ" کی
تکمیل کے لیے کسی خلیجی بینک سے بھی قرضہ لیا
تھا فلم ہندوستان میں تو نرم جا رہی ہے
خلیجی ممالک میں اس کی نمائش کے آثار نہیں
ہیں کیونکہ وہاں کے سنسر بورڈ نے فلم
کو چار مرتبہ دیکھنے کے بعد بھی نمائش کی
اجازت نہیں دی ہے۔

★

لکشمی کانت پیارے لال آج کل اتنے
مصروف ہو گئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے
سے الگ ہو کر کام کرنا پڑ رہا ہے پیارے
لال مدراس میں "مانگ بھرو سجنا" کی
بیک گراؤنڈ موسیقی مکمل کر رہے ہیں تو
دوسری طرف لکشمی کانت ممبئی میں "دو پریمی"
کی بیک گراؤنڈ موسیقی ترتیب دے رہے ہیں۔

★

سنا جا رہا ہے کہ فلمی کہانی کاروں کی مشہور جوڑی
اب ایک فلم کے لیے ۲۵ لاکھ روپے لے رہی ہے
اس وقت اگر یہ مبالغہ بھی ہے تو آنے والی دو تین
فلموں کی کامیابی کے بعد یہ بات حقیقت
ثابت ہو سکتی ہے

فلمی تبصرے　　　تماشائی

دوستانہ

"دوستانہ" سلیم جاوید کی اس سال ریلیز ہونے والی تین بڑی فلموں میں سے ایک ہے۔ دوسری دو فلمیں "شان" اور "کرانتی" ابھی ریلیز نہیں ہوئی ہیں۔ باکس آفس پہ "دوستانہ" "قربانی" کے بعد سب سے زیادہ کامیاب فلم ثابت ہوئی ہے ویسے نام کی مناسبت سے اس سے پہلے بننے والی دو فلمیں "دوستی" اور "دوست" بھی اپنے زمانے کی کامیاب فلمیں تھیں۔ لیکن باکس آفس کی اس کامیابی سے قطع نظر ایسا لگتا ہے کہ سلیم جاوید کا قلم رفتہ رفتہ فنکارانہ آب و تاب سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ یا یہ بات بھی ہو سکتی ہے کہ "شان" اور "کرانتی" کی وجہ سے سلیم جاوید اس فلم پر پوری توجہ نہ دے پائے ہوں۔ فلم کا موضوع انتہائی پٹا پٹایا ہے۔ محبت کے مثلث پر "انداز" سے آج تک ان گنت فلمیں بن چکی ہیں لیکن محبوب کا انداز (میر کے انداز کی طرح) ہر فلم ساز اور ہدایت کار کے لیے قابلِ رشک بنا رہا۔ نیش جوہر کی "دوستانہ" کے ہدایت کار راج کھوسلہ نے فلم کے فن کارانہ پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور یہی فلم کا روشن پہلو ہے۔

"دوستانہ" کے مثلث کے پہلے خط میں یہ بتایا گیا ہے کہ وجے ورما (امیتابھ بچن) اور روی کپور (شتروگھن سنہا) ایک دوسرے پر جان دینے والے دوست ہیں بلکہ ایک جان دو قالب ہیں۔ وجے ورما سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر ہے اور مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے اور قانون شکنوں کو سزا دلوانے کے لئے جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ دوسری طرف اس کا جگری دوست روی کپور جو فوجداری کا انتہائی کامیاب اور مشہور وکیل ہے اپنی ذہانت اور قانون دانی کے سہارے ملزموں کا سہارا بنا ہوا ہے۔ یہ ملزم بدنام اسمگلر ڈاگا (پریم چوپڑہ) کے آدمی ہیں۔ ڈاگا کا گروہ جب بھی اپنے اسمگلنگ کے منصوبے کو عملی جامہ پہناتا ہے تو اس کی اطلاع ٹونی (پران) کے ذریعے وجے کو مل جاتی ہے اور سونے کے ساتھ ساتھ ڈاگا کے آدمی بھی پولیس کے قبضے میں آجاتے ہیں۔ یہاں روی کپور جو ڈاگا کا وکیل ہے ملزموں کو حوالات سے نکال لاتا ہے۔ وجے اور روی کا یہ ٹکراؤ تو جاری رہتا ہے لیکن دوستی پر آنچ نہیں آتی۔ ظاہر ہے کہ دونوں میں پلنے والی اس دوستی پر آنچ آنے کے لئے تو ایک چنگاری کی ضرورت ہوتی ہے جو دلوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس چنگاری کو جنم دینے کے لیے ایک حسینہ شیتل (زینت امان) نمودار ہوتی ہے۔ شیتل اپنے نیم عریاں جسم کے ساتھ دلچسپ حالات میں وجے سے ٹکراتی ہے۔ وجے پہلے تو جسم کی عریانی کے خلاف اسے نصیحت کے کڑوے گھونٹ پلاتا ہے پھر چشم میگون سے محبت کی شراب پی کر بڑے ڈرامائی انداز میں اس کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ اس درمیان شیتل کی ملاقات روی کپور سے بھی ہوتی ہے اور روی حسن کے دربار میں دل کا مقدمہ ہار جاتا ہے۔ اپنے جوہو کے پلاٹ پر وہ شیتل کی پسند کا مکان تعمیر کرواتا ہے لیکن اینٹ پتھر اور سمنٹ کا محل جب تیار ہوتا ہے تو روی کو پتہ چلتا ہے کہ اس کے خوابوں کا محل ڈھ چکا ہے اور اس کا دوست وجے شیتل کو اس سے چھین چکا ہے۔ یہاں سے دوستی دشمنی میں بدل جاتی ہے اور مثلث کا دوسرا خط شروع ہوتا ہے۔ روی کپور وجے کو زک دینے کے لیے ڈاگا سے ہاتھ ملاتا ہے اور ایک دو جگہ وجے کو پشیمانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پھر ڈاگا کی سازش کے نتیجہ میں وہ ایک بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ڈاگا کے ایک ساتھی کو وجے گرفتار کرتا ہے لیکن تفتیش کے بعد حوالات میں اس کی موت واقع ہوتی ہے۔ زیسے

اس کی موت کے ذمہ دار ڈاگا کے آدمی ہوتے ہیں لیکن الزام وجے کے سر آتا ہے کہ اس کی سنجی اور بے رخی کی وجہ سے ملزم کو حوالات میں دم توڑنا پڑا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بتاتی ہے کہ اس کی موت گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی وجہ سے ہوئی۔ وجے بے گناہ ہے لیکن اپنی بے گناہی کو ثابت کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ شیتل شہر کے ہر بڑے وکیل کے پاس جاتی ہے کہ وہ وجے کا مقدمہ لڑے لیکن کوئی بھی اس کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ شیتل سے کہتے ہیں کہ اس مقدمے میں کوئی دم نہیں ہے اور وجے کو سخت سے سخت سزا ہو سکتی ہے۔ شیتل آخرکار روی کپور کے ہاں پہنچتی ہے جو صرف ایک شرط پر مقدمہ لڑنے کے لیے تیار ہوتا ہے کہ جس دن وہ وجے کو عدالت سے بری کروالے گا اس رات شیتل اس کے ساتھ گزارے گی۔ شیتل محبوب کی زندگی کی خاطر اس قربانی کے لئے بھی تیار ہو جاتی ہے۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوتا ہے اور روی قانونی موشگافی اور اپنی ذہانت سے وجے کو باعزت بری کروالیتا ہے۔ روی کامیابی کے نشہ میں سرشار اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے چلتا ہے کہ اسے شیتل کا موسومہ وجے کا لکھا ہوا خط ملتا ہے۔ اس خط میں وجے نے شیتل کو لکھا تھا کہ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ روی بھی شیتل کو چاہتا ہے اور وہ روی سے دوستی کے ناطے اپنی محبت کو قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔ روی کی غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔ انتقام کا جذبہ ندامت میں بدل جاتا ہے اور وہ محبت اور خلوص کے ساتھ ایک بار پھر اپنے جگری دوست وجے کو گلے لگا لیتا ہے۔ یہاں سے مثلث کا آخری خط شروع ہوتا ہے۔ ڈاگا، روی اور وجے کا دشمن ہو جاتا ہے اور روی کا اغوا کر لیتا ہے۔ مار دھاڑ اور بھاگ دوڑ کے اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ ڈاگا کو تو کامیابی نصیب ہونے سے رہی۔ وجے اور روی ڈاگا پر وجے پلتے ہیں اور شیتل اپنے وجے کو پا لیتی ہے

کہانی میں کوئی نیاپن نہیں ہے

پیشکش بھی روایتی انداز کی ہے خط کے نہ ملنے سے پیدا ہونے والی غلط فہمی فلم "سنگم" کی یاد دلاتی ہے۔ ٹونی کے تعلق سے یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کی موت اور لڑکے کے اپاہج ہونے کا بدلہ لینے کے لئے ڈاگا کے خلاف پولیس کو معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ لیکن اگر ڈاگا سے بدلہ لینا ہی تھا تو INFORMER کی طرح چھوٹی چھوٹی اطلاعات پولیس تک پہنچانے کی بجائے ڈاگا کے اہم راز ہیلن کے ذریعے حاصل کر کے پولیس کی مدد سے ڈاگا کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ اداکاروں میں امیتابھ بچن، اشتر وگھن سنہا اور پریم چوپڑہ نے اپنے کرداروں کو نبھانے کی کوشش کی ہے مگر قابل تعریف کوئی بات نہیں ہے زینت امان کا کردار بے جان ہے اور اس کی اداکاری بھی اپنے کردار سے ہم آہنگ ہے پروین نے اتنا چھوٹا سا رول جس میں کوئی خاص بات نہیں ہے نہ جانے کیسے قبول کر لیا دوسرے اداکار بس ٹھیک ہیں۔ راج کھوسلہ نے نہ جانے کیوں ہیلن کا رقص پیش کرنا مناسب نہ سمجھا جبکہ عام تماشائی ہیلو کو گولف کے میدان پر نہیں بلکہ رقص کے اسٹیج پر دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں لکشمی کانت پیارے لال کی موسیقی اوسط درجے کی ہے۔ آنند بخشی کے گیتوں میں کوئی خاص بات نہیں۔ مرحوم نریمان ایرانی اور ان کے ساتھیوں کی فوٹوگرافی اچھی ہے۔ مختصراً دوستانہ "ایک اوسط درجے کی فلم ہے جو اس لیے دیکھی جا سکتی ہے کہ آج کل اوسط درجے کی فلمیں بھی بہت کمیاب ہو گئی ہیں —

لوٹ مار

نوکیتن انٹرنیشنل

کی "لوٹ مار" دیو آنند کی ناکام ترین فلم ہے۔ دیو کی پچھلی فلموں "ہرے راما ہرے کرشنا" "دیس پردیس" بلکہ "ہیرا پنا" میں بھی کچھ نیاپن تو تھا لیکن "لوٹ مار" میں اس روایتی موضوع کو کہ لوٹ مار اور تشدد کرنے والے آخرکار خود تباہ و برباد ہو جاتے ہیں انتہائی گھسے پٹے اور غیر دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی لیے بے پناہ پبلسٹی

سکے باوجود دیو آنند تماشائیوں کو لوٹ نہیں سکے بلکہ باکس آفس کی مار سے خود لٹ گئے۔ کہانی جس پر دیو آنند اور ہیرکاشن ورما کا نام دیا گیا ہے اور جو ایک بنک کی لوٹ اور ہیرو کی بیوی کی موت سے شروع ہوتی ہے اور ایک کرپٹ تاجر کی بیٹی کے اغوا سے ہوتے ہوئے چور، ڈاکو اور بد معاشوں کے خاتمہ پر ختم ہوتی ہے شروع سے آخر تک کہیں بھی تماشائی کو متاثر نہیں کرتی۔ اسکرین پلے اور مکالمے جن پر دیو آنند اور سورج سنم کا نام ہے کہانی کی طرح بے جان ہیں دیو آنند پوری فلم پر چھایا ہوا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ فلم تماشائیوں کے ذہن پر نہیں چھاتی۔ اداکاروں میں امجد خان سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ دوسرے اداکاروں میں محمود، پریم چوپڑہ، ڈاکٹر[illegible] رام لاگو، رنجیت، اور قادر خان قابل ذکر ہیں ٹینا منیم بس ٹھیک ہے۔ امیت کھنہ کے گیتوں اور راجیش روشن کی موسیقی میں کوئی کشش نہیں ہے۔ فوٹوگرافی اچھی ہے اور رقص خوبصورت انداز میں فلمائے گئے ہیں۔ "لوٹ مار" دیکھنے کا مشورہ صرف فلم کی پبلسٹی کرنے والے ہی دے سکتے ہیں اور وہ بھی اپنے معاوضہ کی خاطر۔

بقیہ سلسلہ فلمی ڈائری

ادھیکار انٹرنیشنل کی فلم "نغمہ" کا فلم ساز نکہت ساگر ہے جو فلم ساز ایس۔ ایم ساگر کا لڑکا ہے۔ اس کے ہدایت کار معین امجد اور ارم سلطان پوری ہیں۔ ارم سلطان پوری "مجروح سلطان پوری" کے فرزند ہیں۔ فلم کی موسیقی واجد نوشاد کی ہے جو نوشاد کے لڑکے ہیں۔

جن کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے زر سالانہ روانہ کر کے تجدید خریداری کروالیں۔

منیجر

Registered with the Registrar of Newspaper Registered No. 8285/84

E : 6 Phone ; 52957

POONAM URDU MONTHLY

fice : Azampura, Hyderabad-500024 Editor : Nasir Kurnooli, M.A;